اُردو طنز و مزاح پر مبنی دو ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

مارچ ۲۰۱۸ء تا اپریل ۲۰۱۸ء

مُدیر:
نوید ظفر کیانی

اُردو طنز و مزاح پر مبنی دو ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

مارچ ۲۰۱۸ء تا اپریل ۲۰۱۸ء

شمارہ نمبر ۱۵

مُدیر:

نوید ظفر کیانی

مشاورت:

کے ایم خالد

خادم حسین مجاہد

روبینہ شاہین

محمد امین

ارمغانِ ابتسام

http://www.facebook.com/groups/837838569567305/

برقی ڈاک کا پتہ برائے خط و کتابت

mudeer.ai.new@gmail.com

حلقہ ارباب مزاح

مزاح نگار ڈائریکٹری

مرتب کرنے کا ارادہ رکھتا ہے حلقہ ارباب مزاح کی خواہش ہے پوری دنیا میں بسنے والے ہر اس مزاح نگار کا تعارف اس میں شامل ہو جس کے قلم نے کسی بھی ذی روح کے ہونٹوں پر مسکان دی ہو

زیادہ سے زیادہ آٹھ سو الفاظ پر مشتمل اپنا تفصیلی تعارف ان پیج فارمیٹ میں اپنی خوبصورت ترین تصویر (شادی والے دن کے علاوہ) حلقہ ارباب مزاح کو ای میل ایڈریس halqa.mezah@gmail.com پر ای میل کر دیں۔ آپ کا تعارف درج ذیل نکات کا احاطہ کرتا ہو۔

☆ پیدائش کا علاقہ (شہر اور ملک)، گردش دوراں نے کون کون سے علاقے دکھائے اور موجودہ سکونت کس شہر (ملک) میں ہے۔
☆ اسکول، کالج یونیورسٹی کے نام اور تعلیمی دور کا کوئی یادگار واقعہ
☆ لکھنے کا آغاز کتنی عمر اور کہاں اور کس ادیب سے متاثر ہو کر کیا، پہلی تحریر کہاں چھپی۔
☆ جرائد، اخبارات اور ویب سائٹس کے نام۔
☆ کسی ادبی شخصیت سے دوستی یا ملاقات کا کوئی واقعہ
☆ شائع شدہ کتابوں کے نام پبلشرز کی تفصیل کے ساتھ (اگر شائع ہوئی ہوں)۔
☆ مستقبل میں آنے والی کتابوں کے نام۔
☆ کسی ریڈیو یا ٹی وی کے پروگرام میں شرکت کی ہو تو چینل اور پروگرام کا نام۔
☆ حکومت یا کسی ادارے سے کوئی ایوارڈ حاصل کیا ہو تو اس کی تفصیل۔
☆ رہائش کا پتہ (آپشنل) ای میل ایڈریس (ضروری)، موبائل فون (آپشنل)
☆ فیس بک آئی ڈی (ضروری)، ٹویٹر آئی ڈی (اگر ہے تو)، سکائپ (اگر ہے تو)
☆ چند تحریروں کے ویب سائٹ لنک یا اپنی تحریر کے چند سیکن نمونے ضرور ای میل کریں۔

اگر فیس بک کے دوست اپنے قرب و جوار میں رہنے والے کسی مزاح گو شاعر، مزاح نگار یا کارٹونسٹ سے واقف ہوں تو ان کا تعارف حلقہ ارباب مزاح تک پہنچائیں تا کہ ان کا تعارف "مزاح نگار ڈائریکٹری" کی زینت بن سکے۔

مزاح نگاروں کا ایک با اعتماد، نمائندہ حلقہ

کیا کیا کہاں کہاں

ھنسیتالیات

مزاحیے

نظمالوجی

سفر وسیلۂ ظفر

کتابی جہت

مختصر بُر اثر

مشتری ھوشیار باش

ارمغانِ ابتسام کے گزشتہ شمارے archive.org کے ذیل کے ربط پر دستیاب ہیں:
https://archive.org/details/@nzkiani

ماہِ فروری کے دوران ''ارمغانِ ابتسام'' کے مجلسِ مشاورت کے اراکین جناب کے ایم خالد کے بھائی اور جناب خادم حسین مجاہدؔ کے والد قضائے الٰہی سے انتقال فرما گئے ہیں۔ انا اللہ وانا علیہ راجعون۔ ادارہ دونوں حضرات کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومین کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ درجے سے نوازے۔ آمین۔

یوں تو مزاح کی کئی قسمیں ہیں جن سے اہلِ ادب اور باذوق عموماً اور مزاح نگار خصوصاً واقف ہیں۔ موجودہ دور میں مزاح کی کچھ نئی اقسام منصۂ شہود پر آئی ہیں جن کا ذکر دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان میں سب سے پہلی قسم سیاسی مزاح کی ہے۔ اکثر سیاست دان اس میں بے پناہ مہارت رکھتے ہیں اور کسی بھی سیاست دان کی انتخابی تقریر اس سے خالی نہیں ہوتی۔ مثلاً ''میں چند سال میں ہی دودھ اور شہد کی نہریں بہادوں گا، حلقے کو پیرس بنادوں گا گھر گھر بجلی، پانی، گیس ملے گی۔'' شروع شروع میں لوگ ان باتوں کو سنجیدگی سے لے کر یقین کر لیتے تھے پھر بار بار کے تجربات کے بعد ایسی باتوں پر ہنسی آنے لگے اور اب تو یہ سب سن کر بور ہونے لگتے ہیں کیونکہ پانچ سال بعد بھی انہیں اپنی تقریر میں کوئی تبدیلی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کوئی وعدہ پورا کریں تو اسے تقریر سے نکالیں۔ اکثر سیاستدان پانچ سال اس لئے کوئی کارکردگی نہیں دکھاتے کہ اگر سارے کام کردئے تو اگلی بار کن وعدوں پر ووٹ لینے ہیں۔

مزاح کی دوسری قسم ''دیواری مزاح'' کی ہے جس میں بڑا ہی تنوع ہے۔ یعنی اس کی کئی ذیلی قسمیں ہیں مثلاً یہ لطیفے تو آپ نے اکثر دیواروں پر لکھے ہوں گے کہ ''یہاں پیشاب کرنا سخت منع ہے خلاف ورزی کرنے والے کو حوالۂ پولیس کیا جائے گا'' یا پھر ''وہ دیکھو گدھا پیشاب کر رہا ہے'' لطیفے والیبات ان میں یہ ہے کہ آپ نے ہمیشہ مجبور لوگوں کو ایسی جگہوں پر اپنا مثانہ خالی کرتے دیکھا ہوگا کیونکہ یار لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جہاں ایسی تنبیہات درج ہوں، وہی مناسب جائے فراغت ہیں۔ حتیٰ کہ اوّل الذکر وارننگ کو بے اثر دیکھ کر موخر الذکر وارننگ لکھی جاتی ہے لیکن جب انسان ایسی ایمرجنسی میں ہوتا ہے تو اسے وارننگ پڑھنے کا ہوش ہی کب ہوتا ہے اور اگر پڑھ بھی لے تو خاطر میں کب لاتا ہے۔ کون سا آج تک اس سنگین جرم پر کوئی حوالۂ پولیس ہوا ہے یا کہنے سے کوئی گدھا بنا ہے۔ بچپن میں جب ہم موخر الذکر وارننگ پڑھتے تھے تو بہت حیران ہوتے تھے کہ جب وہاں کوئی گدھا پیشاب کر ہی نہیں رہا تو ایسا لکھا کیوں ہے۔ دیواری مزاح کی دوسری قسم زنانہ و مردانہ پوشیدہ امراض کے تیر بہدف علاج والے حکماء اور دوا خانوں کے اشتہارات ہیں، جن کے باعث یہ پوشیدہ امراض اب قطعاً پوشیدہ نہیں رہے اور سائنس کی ترقی کے باوجود ان امراض میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوا ہے اور شائد اس کی ایک وجہ یہ اشتہارات بھی ہیں کیونکہ ان سے علاج کے بعد عموماً نہ رہتا ہے بانس اور نہ ہی بجتی ہے بانسری۔ دیواری مزاح کی تیسری قسم ان عاملوں، کامل بابوں اور پیروں کے اشتہارات ہیں جن میں سے اکثر خدائی اختیارات کے مالک ہونے کے دعویدار ہوتے ہیں بلکہ ممکن ہے کہ اللہ تو آپ کا کام کرنے میں کچھ دیر لگادے لیکن یہ منٹوں میں ہر مراد پوری کرنے کی گارنٹی دیتے ہیں۔ کون سا کام ہے جو یہ نہیں کر سکتے، یہ الگ بات ہے کہ یہ معمولی معمولی کاموں میں ہاتھ ڈالنا پسند نہیں کرتے۔ مثلاً مسئلۂ کشمیر، لوڈشیڈنگ، دہشت گردی، مہنگائی، امن وامان اور ملکی خوشحالی وغیرہ ورنہ یہ ان کے بائیں ہاتھ کے کھیل ہیں۔ اس میں مزید مزے کی بات یہ ہے کہ ان سے لاکھوں یا ہزاروں لٹوانے کے باوجود متاثرین اس ڈر سے منہ نہیں کھولتے کہ ان کے مؤکل پکڑ لیں گے۔ حالانکہ اگر ان کے مؤکل ہوتے تو ان کا کام ہی نہ ہوجاتا۔ مزید یہ کہ اس میدان میں مردوں کی اجارہ داری اور پیداگیری دیکھ کر عورتیں بھی سامنے آگئی ہیں۔ گو جو جو عیاشیاں مرد عامل کرتے ہیں، یہ بیبیاں اس کا تو سوچ بھی نہیں سکتیں لیکن شاید وہ شانہ بشانہ چلنے کی کوشش ضرور کر رہی ہیں۔ بعض اوقات ان کے نام بھی پڑھ کے ہنسی آجاتی ہے مثلاً شادی شہید، باوا کھبے شاہ، میٹروالی سرکار، سائیں طوطا اور بی بی مستانی وغیرہ۔ ایک خاتون نے تو کسی کیمیکل سے ایک ہاتھ کی ہتھیلی پر اللہ اور دوسرے پر محمد ﷺ لکھوار کھا تھا اور اسے معجزہ مشہور کیا ہوا تھا۔ جب کسی نے پوچھا کہ پھر وہ طہارت کس ہاتھ سے کرتی ہیں تو بائیں ہاتھ سے مٹا دیا۔

مزاح کی تیسری قسم برقی مزاح ہے جس کے تحت آپ یہ برقی مجلّہ اور دیگر مزاح پڑھ رہے ہیں۔ مزید ٹیکنالوجی اور میڈیا نے جو نت نئے موضوعات پیدا کردئے ہیں ان سے مزاح کا دامن مزید وسیع ہوا ہے اور ہمارے مزاح نگار ان موضوعات پر لکھ کر آپ کی تفریحِ طبع کر رہے ہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی ضرور کیجئے تاکہ وہ یہ سلسلہ جاری رکھیں۔

خادم حسین مجاہد

سیاحت / نوید ظفر کیانی

پورٹلینڈ اور میں

غالباً یہ ۱۸۲۹ء کے اوائل کا ذکر ہے، میں نے اپنے جی میں یہ ٹھان لی کہ چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے، میں نے پورٹلینڈ ضرور جانا ہے۔ میں نے پورٹلینڈ کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا، کیا شاندار جگہ ہے، قصبہ کیا ہے، پارس ہے کہ جو بھی اُسے چھوتا ہے، سونے کا ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کے لوگ اِتنی جلدی کپڑے نہیں بدلتے، جتنی جلدی وہاں کے لوگ امیر ہو جاتے ہیں۔ وہاں سے ہمارے قصبے میں دو تین رسائل آیا کرتے تھے جن میں سے ایک تو غالباً ''پورٹلینڈ کورئر'' تھا اور دوسرا ''فیملی ریڈر'' تھا، ان میں پورٹلینڈ کے بارے میں عجیب و غریب کہانیاں آیا کرتی تھیں۔ خیر یہ کہانیاں مسحور کن حد تک عجیب ہوتی تھیں لیکن غریب کسی صورت نہیں ہوتی تھیں۔ جب میں یہ کہانیاں پڑھا کرتا تھا تو میری کھوپڑی میں پہلے سے بڑھ کر کھد بد ہونے لگتی اور میں پہلے سے زیادہ شدومد سے ارادہ باندھنے لگتا تھا کہ میں نے پورٹلینڈ جانا ہے اور بس۔

آخر ایک دن میں نے اپنے والد سے کہا ''پاپا! میں نے پورٹلینڈ جانا ہے اور ہر حال میں جانا ہے، یہ دیکھنا ہے کہ آخر یہ پورٹلینڈ کس مٹی سے بنا ہوا ہے۔

پاپا نے پہلے تو مجھ پر متوقع گھوری ڈالی اور پھر سمجھاتے ہوئے انداز میں کہا کہ بیٹا، تم بہت بھولے بھالے اور سیدھے بچے ہو، پورٹلینڈ تمھیں نگل جائے گا، تم گم ہو کر رہ جاؤ گے لیکن جب اُنہوں نے دیکھا کہ میرے کان پر جوں بھی نہیں رینگ رہی ہے تو اُنہوں نے مجھے مزید سمجھانا موقوف کر دیا اور اپنی گدڑی پر جھکے، اُسے کھولا

رہی ہے تو اُنہوں نے مجھے مزید سمجھانا موقوف کر دیا اور اپنی گدڑی پر جھکے، اُسے کھولا اور ایک عدد ڈالر اُس میں سے برآمد کیا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے ''سمتھ بیٹا، میں تمھارے لئے اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا، اگر تم نے وہاں جانا ہی ہے تو ٹھیک ہے، جم جم جاؤ اور خوب پھلو پھولو، لیکن یاد رکھنا، ایمانداری کا دامن ہاتھ سے ہرگز ہرگز نہ چھوڑنا، امید ہے کہ مجھے تمھارے بارے میں ہمیشہ اچھی خبر سننے کو ملے گی۔''

یہ کہہ کر وہ خاموشی سے اُٹھے اور کمرے سے جانے لگے، میں نے اُن کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک واضح طور پر دیکھ لی تھی، ہاں البتہ میری ماں نے پاپا کی طرح نہیں کیا بلکہ گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گئی اور باقاعدہ ''کوکیں مارنے'' لگی۔

اُن کے اس طرزِ عمل نے میرے مصمم ارادوں کو چند لمحوں کے لئے متزلزل کر دیا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ مجھے پورٹلینڈ جانے کی ضد چھوڑ دینی چاہیئے، غالباً پپا ٹھیک کہتے ہیں، میں ناتجربہ کار اور سیدھا سادا دیہاتی نوجوان ہوں، بلکہ لڑکا بالا ہوں، پورٹلینڈ واقعی ایک بہت بڑا اژدھا ہے، مجھے نگل جائے گا، لیکن عین اُسی لمحے کئی برسوں سے چاٹے ہوئے رسائل اور بولتے ہوئے ہونٹوں کے دکھائے ہوئے سبز باغ آنکھوں میں لہرانے لگے اور میں نے از سرِ نو کمرِ ہمت کس لی اور اُنہیں حتمی لہجے میں بتا دیا کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا، میں نے پورٹلینڈ ضرور جانا ہے۔

میں نے گھوڑے کی زین کسنے لگا اور اپنا ضروری سامان باندھنے لگا۔ ماں نے میرے زادِ سفر کے طور پر کھانے کا سامان تیار کیا اور اُسے ایک چنگیر میں باندھ دیا۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے پنیر، مکھن، ڈبل روٹی اور اسی نوع کی دوسری کھانے پینے کی چیزیں بھی تیار کیں اور ایک گٹھڑی میں باندھ کر میرے حوالے کر دیا۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے ایک اضافی پتلون اور شرٹ بھی مجھے لپیٹ کر دے دی کیونکہ میں نے اُنہیں بتا دیا تھا کہ مجھے خود بھی نہیں پتہ کہ میں وہاں پر کب تک رہوں گا۔

جب میں گھوڑے پر زین کس چکا تو الوداعی سلام کے لئے اڑوس پڑوس والوں کے پاس گیا، اُن سب لوگوں کی نصیحتوں کو پلے سے باندھا، دعائیں لیں، گھوڑے پر چھلانگ لگا کر بیٹھا اور پورٹلینڈ کے سفر پر روانہ ہو گیا۔

میری چچی سیلی بیاہ کر کے پورٹلینڈ میں سکونت اختیار کیے ہوئے تھی۔ لگ بھگ شام کے وقت پورٹلینڈ پہنچا۔ وہاں پہنچ کر میں پوچھتا پاچھتا چچی سیلی کے پاس جا پہنچا۔ سفر کی تھکان سے بُرا حال تھا، غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ میں اپنے گاؤں سے کہیں باہر گیا تھا اور وہ بھی پورٹلینڈ جیسے بڑے اور دُور افتادہ قصبے میں چنانچہ تھکاوٹ اور ماندگی اچھنبے کی بات نہ تھی۔ رات کا کھانا کھایا اور بستر پر پڑ رہا۔

اگلے روز جب میں بیدار ہوا تو سیدھا قصبے سے نکلنے والے رسالے ''پورٹلینڈ کورئر'' کے دفتر کا رخ کیا۔ کیونکہ میں مہینوں اُس کے مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس قصبے میں ''پورٹلینڈ کورئر'' کا مدیر ہی ایک ایسا شخص تھا جو میرے کام آسکتا تھا اور اس بارے میں میری رہنمائی کر سکتا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ جب میں اُس سے ملا تو اپنے قیافہ شناسی پر پچھتایا نہیں کیونکہ اُسے اپنی توقعات کے عین مطابق پایا۔ اُس نے نہایت شفقت سے میرا ہاتھ پکڑا اور سمجھانے کے انداز میں گویا ہوا ''محترم، میں اپنی پوری پوری کوشش کروں گا کہ تمھارے ہر طرح کام آؤں۔ تم بالکل ٹھیک جگہ پر آئے ہو۔ یہ ایک صحت مند مواقع سے بھرپور قصبہ ہے۔ وہ لوگ جو کاروباری لیاقت رکھتے ہیں، یہاں خاصی ترقی کر سکتے ہیں۔ بس ذرا دماغ کو حاضر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بسا اوقات ہم جلد بازی میں غلط فیصلے کے مرتکب ہو جاتے ہیں اور پھر ساری زندگی پچھتاتے رہتے ہیں۔ کاروباری دنیا میں قسمت آزمائی کرتے وقت دماغ کو حاضر رکھنا چاہیئے اور ہر فیصلہ بروقت اور سٹیم بوٹ کی سی رفتار سے کرنا چاہیئے۔''

''اچھا، یہ سٹیم بوٹ صاحب کیسے فیصلہ کرتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ اُس وقت مجھے سٹیم بوٹ صاحب کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہ تھا، کیونکہ میں نے اُس کا کہیں ذکر نہیں سنا تھا۔

''ارے بھئی، میں نے تو صرف مثال دی تھی۔'' وہ غالباً میرے لاعلمی پر مبنی فقرے کو میرے طنز و مزاح کا کوئی انداز سمجھا۔

''یہاں تمھیں بھانت بھانت کے لوگوں سے پالا پڑے گا، کچھ مخلص لوگ ہوں گے اور کچھ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے، کسی سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں، بس یوں سمجھ لینا کہ تم اپنے گاؤں میں ہو اور تمھیں اپنے مویشیوں سے نمٹنا پڑ رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم یہاں بہت کامیاب ہو گے، اللہ تمھارا حامی و ناصر ہو۔'' اُس نے بات ختم کی لیکن اس کے ساتھ ہی اُسے جیسے کچھ یاد آ گیا ''ایک بات پلے سے باندھ رکھو، تم ایک صاف وشفاف اور دور دراز گاؤں سے آئے ہو اور نہایت سیدھا سادا اور سچا کھرا پس منظر رکھتے ہو، پورٹلینڈ کے چند ایک حیلہ جو لوگوں سے بچ کر رہنا، خصوصاً ''ہملکر رو'' سے ہوشیار رہنا کیونکہ اُس کا مالک بہت تیز شخص ہے، تمھیں گھیر لے گا۔ جو بھی اس کے ہتھے چڑھتا ہے، اُس سٹی گم کر دیتا ہے۔ وہاں اگر گئے تو دماغ کو حاضر رکھنا اور حواس باختہ مت ہونا۔''

جب وہ اپنے تئیں مجھے ہر طرح سے ہتھیار بند کر چکا تو میں نے سیلی چچی جان کے گھر کا رُخ کیا اور ناشتہ کیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں قصبے کی سیر کو نکلا، سیر کے ساتھ ساتھ یہ دیکھنا بھی مقصود تھا کہ یہاں میں کس طور قسمت آزمائی کر سکتا ہوں اور کس قسم کا کاروبار شروع کیا جا سکتا ہے۔

میں چار پانچ گھنٹوں تک قصبے میں گھومتا رہا۔ ایک ایک جگہ کو ذہن نشین کرتا رہا۔ بہت سے لوگوں سے علیک سلیک ہوئی۔ جب قصبے کے بالائی علاقے کی طرف آیا تو دیکھا کہ وہاں بہت سی اقسام کی چھوٹی بڑی دکانیں ہیں۔ ایک بہت بڑی دکان کے سامنے جا کر میں رُک گیا۔ یہ دکان بھی اپنی نوعیت کی واحد دکان تھی۔ دکان میں ہر قسم کی اشیاء موجود تھیں اور وہ ناکوں ناک بھری ہوئی تھی۔ میں نے ایک راہگیر سے پوچھا ''کیوں صاحب، یہ کیسی دکان ہے؟''

''ارے آپ نہیں جانتے، یہ ''ہملکر رو'' ہے۔'' اُس نے مجھے حیرانی سے دیکھتے ہوئے بتایا۔

''اوہ اچھا، تو یہ وہی ہملکر رو ہے جہاں سے قصبے کے تمام چھوٹے تاجر تجارتی اشیاء لے کر جاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''جی جی، آپ بالکل ٹھیک سمجھے۔'' وہ بولا۔

میں نے راہگیر کا شکریہ ادا کیا اور اپنے آپ سے کہا کہ اب ذرا دکان کے اندر جا کر دیکھنا چاہیئے کہ اس کا مالک سٹی گم کرنے کا کام کیسے کرتا ہے۔ اگر میں اس کے مقابلے کے امتحان میں پورا اُترا اور حواس باختہ ہونے کے بجائے حواس باختہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تو یقیناً میں یہاں کے ماحول کو اپنے مستقبل کے لئے خوش آئند بنا سکوں گا، دوسری صورت میں مجھے واپسی کا ٹکٹ کٹوا رکھنا چاہیئے۔

میں سٹور میں داخل ہو گیا۔ کاؤنٹر کے پیچھے ایک گرگِ باراں دیدہ چشمہ ناک پر جمائے بیٹھا ہوا تھا۔ دکان میں شوکیسوں میں طرح طرح کی خورد ونوش کی اشیاء بہاریں دکھا رہی تھیں۔ بلاشبہ پورٹلینڈ ایک ترقی یافتہ قصبہ تھا، مواقع سے بھرپور۔ ایک شوکیس میں بسکٹ پر نظر پڑی تو منہ میں پانی بھر آیا، میں نے اُس بوڑھے سے پوچھا ''کیوں جناب، یہ بسکٹ کس بھاؤ ہیں؟''

''ہر بسکٹ ایک سینٹ کا ہے۔'' اُس نے بتایا۔

''میں تین بسکٹ لینا چاہتا ہوں، اس کے آپ کو دو سینٹ دوں گا، اگر آپ کو منظور ہو تو مجھے نکال دیجئے، میں اسے چکھنا چاہتا ہوں، اگر مناسب لگا تو مزید خریداری بھی کروں گا۔''

''میں کسی دوسرے کو اس قیمت پر ہرگز ہرگز نہیں بیچتا لیکن آپ کی بات اور ہے، آپ بخوشی لے سکتے ہیں۔'' اُس نے آنکھوں کو طوطے کی طرح گھماتے ہوئے کہا۔

میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے کہ صرف میری خاطر وہ بسکٹ رعایتی نرخوں پر دے رہا ہے، میں کوئی اُس کے مامے کا پتر تھا؟ خیر اُس نے شوکیس سے بسکٹ نکال کر مجھے تھما دئے اور میں بسکٹ لے کر دکان میں مٹر گشت کرنے لگا اور گھوم پھر کر دیکھنے لگا کہ دکان میں اور کیا کچھ ہے۔ ٹہلتے ٹہلتے میں نے اُس سے پوچھا ''کیوں جناب، آپ کے پاس سیب کا جوس ہے؟''

''جی بالکل، ایسا مزیدار ہے کہ آپ نے پہلے کبھی پیا نہیں ہو گا۔'' اُس نے کہا۔

''اچھا، کتنے کا گلاس دیتے ہیں؟'' میں نے دریافت کیا۔

’’دو سینٹ فی گلاس ہے۔‘‘ اُس نے بتایا۔

’’اچھا، مجھے لگتا ہے کہ مجھے بھوک اتنی نہیں لگی جتنی پیاس لگی ہے، کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ بسکٹ مجھ سے واپس لے لیں اور اس کی جگہ مجھے ایک سیب کا گلاس عنایت فرمادیں؟‘‘ میں نے ملتجی لہجے میں کہا۔

’’کیوں نہیں جناب، ضرور، ضرور!!‘‘ اُس نے بڑے خلوص سے کہا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اجناس خوردونوش کی ورائٹی نے مجھے خیرہ کرکے رکھ دیا ہے۔ اُس نے بسکٹ مجھ سے لے کر واپس شوکیس میں رکھے اور ایک گلاس میں سیبوں کا جوس انڈیل کر مجھے تھما دیا۔ میں نے گلاس سے جوس کی ایک چسکی لی۔ واقعی اُس نے ٹھیک دعوٰی کیا تھا۔ جوس لاجواب تھا۔ کم ازکم میں نے ایسا مزیدار جوس پہلے کبھی نہیں پیا تھا۔

گلاس ختم کرکے میں نے اُسے تھمایا اور بڑے اطمینان سے کہا ’’میرا خیال ہے کہ کافی وقت ہوگیا ہے، اب مجھے چلنا چاہیے۔‘‘ یہ کہہ کر میں دکان سے باہر جانے لگا۔ بوڑھا کاؤنٹر کے پیچھے سے تیر کی طرح نکلا اور میرا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔

ٹھہریئے جناب، میرا خیال ہے کہ آپ نے مجھے سیبوں کے جوس کی ادائی نہیں کی۔‘‘ اُس نے کہا۔

’’ایں؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب، کیا میں نے آپ کو بسکٹ نہیں دیئے تھے، جوس کے بدلے!‘‘ میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

’’ایں۔۔۔ہاں آں۔۔۔‘‘ وہ ٹھہر سا گیا۔ میں نے دکان کے دروازے کی طرف قدم بڑھائے لیکن دکان سے نکلنے سے پہلے ہی اُس نے مجھے جالیا ’’ٹھہریئے جناب، ٹھیک ہے، آپ نے سیبوں کے جوس کی ادائی تو کردی ہے لیکن بسکٹوں کی ادائی تو نہیں کی ناں۔‘‘ اُس نے پُرجوش انداز میں کہا۔

’’یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب‘‘ میں نے مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کیا ’’آپ مجھ سے کس چیز کے پیسے طلب کررہے ہیں۔ اُن بسکٹوں کے جو میں نے لیئے ہی نہیں، اگر بسکٹ میں نے لیئے ہیں تو آپ نے مجھ سے لے کر کیا شے شوکیس میں رکھی تھی؟‘‘

اُس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ میں بڑے اطمینان سے دکان سے نکلتا چلا گیا۔

میرا مقصد اُس بوڑھے دکاندار کو دھوکہ دینا نہیں تھا۔ میں نے تو اُس سے ایک چھوٹا سا مذاق کیا تھا، بس اُس پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہر چند میں پردیسی ہوں اور اچھا خاصا ’’سیدھا سادا‘‘ دیہاتی شخص واقع ہوں لیکن پھر بھی مجھے ترتوالہ بنانا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں، چنانچہ اگلے دن میں دوبارہ اُس دکان میں گیا اور اُن دوسینٹ کی ادائی کردی۔ اُس موقع پر اُس بوڑھے شخص نے مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر کرنے میں دیر نہیں کی اور میں نے بھی اُس کی آفر قبول کرنے میں دیر نہیں کی۔

ٹھیک دوسال بعد جب میں اپنے ماں باپ سے ملنے اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہوا تو میرے ساتھ ایلس بھی تھی۔ ایلس اُسی آنجہانی بوڑھے دکاندار کی ماہ رو بیٹی تھی جس سے اُس کے مرحوم باپ نے مجھ ’’سیدھے سادے دیہاتی شخص‘‘ کی شادی کردی تھی اور اب میں پورٹلینڈ میں ’ہکلر روُ‘ نامی کاروبار کا واحد مالک و مختار تھا۔

امریکہ کے معروف مزاح نگار سیبا سمتھ (Seba Smith) (۱۴ر ستمبر ۱۷۹۲ء تا ۲۸ر جولائی ۱۸۶۸ء) بکفیلڈ مینے میں پیدا ہوئے، ’’ایلزبتھ اوک سمتھ‘‘ سے شادی کی جو خود اُن سے زیادہ معروف ادیبہ تھیں۔ بہت سے اخباروں کے مدیر رہے جن میں ’’ایسٹرن آگسٹ‘‘ اور ’’پورٹلینڈ کوریئر‘‘ شامل ہیں۔ لاتعداد فکاہی مضامین قلمبند کیے۔ اُن کا تخلیق کردہ ایک کردار ’’میجر جیک‘‘ ۱۸۳۳ء کے اوئل میں خاصا مشہور رہا ہے۔ اُن کا اندازِ طنز و مزاح اپنے وقتوں میں منفرد حیثیت کا حامل تھا چنانچہ انیسویں صدی کے زیادہ تر مزاح نگاروں نے اُن کے اندازِ تحریر کی پیروی کی۔

روحانی ریمانڈ

سیّد عارف مصطفیٰ

صاحبو! مجھ سے اگر کوئی یہ پوچھے کہ انسانی اعصاب کے لیے سب سے کڑا وقت کون سا ہوتا ہے تو میں بلا تردد عرض کروں گا کہ "عین اس وقت، کہ جب کوئی لکھنے پڑھنے والا فرد نصف شب کے بعد کسی بے تاب قوال سے بہت کم فاصلے پہ موجود ہو۔"

مجھے یقین ہے کہ کسی دوسرے فرد کو میرے اس بیان کی فکرانگیزی اُس وقت تک سمجھ آ ہی نہیں سکتی کہ جب تک کہ وہ خود کبھی اس کڑی آزمائش سے دوچار نہ ہوا ہو اور رات کے پرسکون لمحات میں اُس کی ساعت، اچانک کسی بپھرے ہوئے قوال کے ہتھے نہ چڑھ چکی ہو۔

میری یہ بپتا پرانی نہیں ابھی گزشتہ شب ہی کی ہے کہ جب میرے گھر کے عین سامنے ایک مست قوال محفل سماع کے نام پہ مائیکروفون پر کان پھٹنے اور پو پھٹنے تک نجانے کیا کیا کرنے پہ تلا رہا اور میں گویا شب بھر "روحانی ریمانڈ" پہ رہا۔ ابتداء میں تو میں نے بہت برداشت سے کام لیا اور بہت دیر تک ضبطِ نفس کے طریقے آزماتا رہا لیکن کانوں پہ امنڈتی بانگِ درا جب اسپیکروں کی ہنرمندی سے چنگھاڑتی ضربِ کلیمی بن گئی تو خوار و مضطرب ہو کر خود بھی پر عقیدت سامع بن کر 'وقوعہ' پہ جا پہنچا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ درمیان میں بیٹھا جو شخص متواتر گردن ہلا رہا ہے اور زور زور سے ہاتھ چلا رہا ہے وہی اس "مقدس ورکشاپ" کا استاد ہے اور اُس نے کئی "چھوٹے"، یعنی اپرنٹس قوال آہ و فغاں کے لئے دائیں بائیں ساتھ بٹھا رکھے ہیں جو کہ نہایت متناسب انداز میں گردن مٹکانے کے ساتھ ساتھ اُستادانہ لے کی آنچ بڑھانے کے لئے برابر زوردار تالیاں بھی پچھاڑتے جاتے ہیں۔۔۔ اور تالیاں بھی کیا، گویا ایک ہتھیلی سے دوسری کو اور دوسری سے پہلی کو کس کس کر چانٹے لگا رہے ہیں۔ ہمراہ ایک نائب قوال بھی ہے کہ بار بار بوکھلا کر اچانک اچانک واویلا مچانے کے لئے مخصوص ہے۔ اُس کا دوسرا کام پوری چوکسی سے اپنے سر کو 'استاد' کی تالیوں کے بیچ آ کر چپاتی بننے سے بچانا ہے کیونکہ وہ قوال کے بالکل نزدیک بیٹھا ہے اور ہر لمحے گمان ہوتا ہے کہ اس قربت کی سزا اُسے آج مل کر رہے گی۔ طبلہ ٹھنک رہا ہے اور طبلہ نواز اسی سے ہم آہنگ کر کے اپنی گردن اور دیدے دونوں برابر سے مٹکا رہا ہے۔ ایک لاغر و فاضل سا بچہ بھی وہیں ساتھ دُبکا بیٹھا ہے جس کا کام سوائے اس کے کچھ اور نہیں کہ وقفے وقفے سے چونک کے سیٹی

جیسی باریک اور چبھتی ہوئی آواز میں چیختی ہوئی ’’ایں ایں‘‘ یا ’’ریں ریں‘‘ کرنے کی کوششیں جاری رکھے اور اسٹیج پہ کسی ’’جونیئر قوال‘‘ کو نیند کی جھپکی لینے نہ دے، حاضرین کو جگائے رکھنے کا کام البتہ ’’اِسی چھٹے ہوئے قول‘‘ نے مستقل اپنے ذمے لے رکھا ہے۔

ساز و صدا کی اِسی ہڑبونگ میں دیکھتے ہی دیکھتے میرے سامنے بیٹھے دو افراد دفعتاً ہڑبڑا کر اٹھے اور اسٹیج کی جانب بڑھے اور اسٹیج تک پہنچنے سے پہلے اُن میں سے ایک نے جیب میں ہاتھ ڈالا جس سے میں نے یہ شگون لیا کہ ضبط کی حدیں تمام ہوئیں اور گویا نجات کی گھڑی دور نہیں، لیکن اس کا ہاتھ جب جیب سے باہر آیا تو اس میں ایک کڑک سا نوٹ تھا جسے پھر اُس کے ساتھی نے بھی اُس کے ہاتھ سے ہاتھ ملا کے تھام لیا اور یوں لگتا تھا کہ جیسے اکیلا بندہ اس بھاری رقم کا بوجھ اٹھانے کے لئے کافی نہیں۔ اسٹیج تک پہنچ کر انہوں نے وہ نوٹ گاؤ تکیہ لگائے ایک جبہ پوش بزرگ صورت فرد کے حوالے کیا جو کہ شاید اسی خاص کام پہ مامور تھے کہ وہ ایسی روحانی وصولیاں کریں۔۔۔ مزید ایسی وصولیوں کو یقینی بنانے کے لیئے وہ متواتر تسبیح گھما رہے تھے اور متاثرین کو پیہم اپنی رقم ٹھکانے لگانے کے صحیح مقام کی نشاندہی کر رہے تھے۔ وہ رسیدی بزرگ اپنے سر پہ اتنی شدت سے کس کر پگڑی باندھے بیٹھے تھے کہ اسکے باعث اُن کی آنکھیں مستقل پھٹی پھٹی سی تھیں۔ وصولیوں کا وقفہ لمبا ہونے پہ التجائی لو لگانے کے لیئے جب بھی وہ اپنی آنکھیں بند کرنے کی کوشش کرتے تھے تو اُن کی پگڑی کا شملہ ہل ہل جاتا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے یہ مالیاتی ہڑبڑاہٹ کئی مردانہ جوڑوں پہ بار بار طاری ہوئی اور وہ اسی ہی مشترکہ مشقت سے کئی بھاری نوٹ اپنی منزل تک پہنچاتے رہے۔

وہاں بیٹھے ہوئے مجھے اپنے بیتے ہوئے دنوں کی ایک ایسی ہی محفل یاد آگئی کہ جب ایک دوست نے ایسی ہی اک محفل میں کھینچ لیا تھا۔۔۔ اور وہاں پہنچتے ہی میں نے یہ پایا تھا کہ ایک اچھا بھلا آدمی اگلی صفوں سے ناگاہ جھومتا ہوا اٹھا اور دیوانہ وار گھومنے لگا بالکل پھرکی کی مانند۔۔۔ میں شدید تشویش میں تھا کہ اسے اچانک کیا ہوا اور اس کے باوجود یہ سب حاضرینِ محفل اطمینان سے کیوں بیٹھے ہیں۔۔۔ آخر کوئی ایمبولنیس کیوں نہیں بلاتا۔۔۔ لیکن اسے لپک کے بٹھانے اور فوری طبی امداد دینے یا مساج کرنے کی کوششیں کرنے کے بجائے کئی لوگ اُس پہ والہانہ طور پہ نوٹ نچھاور کرنے لگے۔ میرے چہرے پہ شدید تشویش کے آثار دیکھ کر برابر پلتھا مار کر بیٹھے ایک صاحب نے بڑے رسان سے مجھے بتایا کہ انہیں ’’حال‘‘ آگیا ہے۔۔۔ تھوڑی دیر وہ حال زدہ بے حال صاحب خود بخود فی الحال بھی ہوگئے اور ذرا دیر بعد پھر انہیں یہی دورہ پڑگیا۔ میں نے دیکھا کہ انہیں حال آنے کے فوری بعد ایک چوکس آدمی بھی اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور اس کے جلو میں خمیدہ پشت ہو کر ان ’’حالی‘‘ کے موالی کے طور پہ ان نوٹوں کو سمیٹتا جاتا تھا، بالکل

تانگے کے لفظ پر غور کیا جائے اور پھر تانگے کے ایک ایک جز پر نظر ڈالی جائے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے تانگے سے مراد ہی تنگ کرنا ہے، شائد یہی وجہ ہے کہ تانگہ لاہور کا ہو یا جھنگ کا، تانگے والا سب کی خیر ہی مانگتا ہے۔ تانگے کے ہیرو پر کچھ سلجھی ہوئی نگاہ ڈالی جائے تو اس کا انگ انگ تنگی کا اعلان کر رہا ہوتا ہے، کیونکہ گھوڑے کے منہ، گردن، آنکھوں، کانوں اور دُم پر پوشش کی وائرنگ اسے اس حد تک پارسا بنا دیتی ہے کہ ڈیوٹی کے دوران نہ کسی نامحرم کو میلی نظر سے دیکھ سکتا ہے، نہ ادھر اُدھر سے ڈسکو گانے سُن سکتا ہے۔

''مزاح بخیر'' از تنویر حسین

ایسے جیسے اس کی راہ سے کانٹے چنتا ہو۔ اسی طرح گھومتے اور آنکھیں موندے ہوئے وہ حالی حاضرین کے اندر ہر طرف پھرتا ہوا میرے قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ اپنی موندی ہوئی آنکھوں میں سے بھی بھرپور گنجائش نظارہ بنائے ہوئے ہے۔۔۔ جس پر میں نے جلدی سے اپنا سگریٹ لائٹر جلا کر اس کی جانب کیا اور اس آتش گیر عقیدت کی تاب نہ لا کر اس نے فنافٹ آنکھیں کھول دیں اور سٹپٹا کر نارمل ہو گیا پھر انتہائی قہر آلود نگاہ مجھ پہ ڈال کر ادھر ادھر ہو گیا۔

میں بہت ضبط و تحمل سے کافی دیر تک میں اس محفل میں چوکڑی مارے بیٹھا رہا اور ماحول کا جائزہ لیتا رہا کہ جہاں ایک نہیں کئی کئی لوگ باری باری ''حال'' کے ہاتھوں بے حال ہو جاتے تھے مگر خوب خوب جانتے تھے کہ جھوم کے کس پہ گرنا ہے اور کس کو ''گرانا'' ہے۔ اُدھر قوال بھی ایسا رقم شناس کہ جہاں نوٹ برسنا شروع ہوئے، وہ بہت بہت دیر تک کسی ایک ہی بول پہ اٹکے رہتا اور جب تک کئی لوگ وہاں کھڑے کھڑے اپنی جیبیں نہ جھاڑ دیں، اُس کی قوالی کی گاڑی آگے نہیں بڑھتی تھی۔ تاہم کچھ روحانی متاثرین عقیدت اور کفایت دونوں کا بھرم رکھنے کے لیئے چھوٹے نوٹوں ہی کا تانتا باندھے ہوئے تھے وہاں چند قوالیاں سن کر یہ اندازہ بھی ہوا کہ کلام کیسا ہی عمدہ کیوں نہ ہو اور کیسے ہی بلند مقام شاعر کا ہی ہو، کسی قوال کے ہتھے چڑھ جائے تو وہ اسے ملیدہ کرنے میں ذرا دیر نہیں لگاتا اور نہایت عبرت انگیز بنا کر ہی دم لیتا ہے اور اس کچومر سازی کے باوجود وقفے وقفے سے بے بس سامعین پہ فاتحانہ نظر ڈال کر داد کا بھتہ لینا نہیں بھولتا۔

اُس محفل سے جب میں کافی تھک چلا تو اٹھ کر سونے کو گھر چلا آیا۔ میری خوب گاہ جو اس بزم کے بھاری بھاری اسپیکرز کے عین نشانے پہ تھی تو وہاں اُس کی ہر چیز طبلے کی سنگت پہ بڑی ہم آہنگی سے دھمک رہی تھی، بتی بجھا کر بستر پر لیٹا تو ذرا غنودہ ہوتے ہی شاید آٹھویں یا ساٹھویں زوردار لے سے بے چین ہو کر یکبارگی اُٹھ بیٹھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ قوال پلنگ کے نیچے ہی کہیں موجود ہے یا شاید پردے کی اوٹ میں لپٹا ہوا الاپ رہا ہے۔ میں نے جیسے تیسے اپنے کانوں میں مناسب طور پہ روئی کا انبار ٹھونسا اور غیر ارادی طور پہ آئینے پہ نظر پڑی تو خود کو ہی نیا نویلا مردہ سا پا کر کپکپا اٹھا لیکن یہ ''کپاسی ناکہ بندی'' بھی اس روحانی گڑگڑاہٹ کے سامنے ڈھیر ہو گئی کہ جو اسپیکرز کے راستے قوال کے حلق سے مسلسل برآمد ہو رہی تھی۔ ناچار اس گناہِ بے لذت یعنی مردہ ٹائپ گیٹ اَپ سے عاجز ہو گیا اور سب روئی کانوں سے کھینچ کھانچ کے نکال پھینکی اور واپس اس بے مثل قوال کے چرنوں جا پہنچا اور اس وقت تک وہاں دوزانو بیٹھا رہا کہ جب تک صبح دم میرا یہ روحانی ریمانڈ اختتام کو نہ پہنچا، تاہم اب میں جلد ہی اپنے ایک حریف کے گھر کے عین سامنے ایسی ہی ایک تقریب برپا کرنے کے لیئے سوچنا شروع کر چکا ہوں، بس ذرا مناسب سا چندہ مل جائے۔۔۔ پھر دیکھنا!

سیّد عارف مصطفیٰ کا تعلق کراچی سے ہے۔ موصوف سیاسی تجزیہ کار اور ایک درد دِل رکھنے والے بلاگر ہیں۔ خاصی دبنگ شخصیت کے مالک ہیں اور سچ کہنے اور لکھنے میں کسی قسم کے لحاظ کے قائل نہیں۔ ایک بہت اچھے انشاء پرداز ہیں اور فکاہی اندازِ بیان کی وجہ سے خاصے مقبول ہیں۔ اُردو کو پاکستان کی سرکاری زبان بنانے کی تحریک میں اِن کی مساعی جمیلہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اُردو طنز و مزاح کے فروغ میں بھی اِن کا خاصا ہاتھ ہے، کراچی جیسے آلام زدہ شہر میں فکاہی مجالس برپا کرنا انہیں کا کام ہے۔ ارمغانِ ابتسام کے لئے مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

فہد خان

دستِ پناہ

جاسوسی ناول پڑھنے والے اور ڈاکے مارنے والے قارئین ''ماسٹر کی'' کے نام سے بخوبی واقف ہوں گے۔ یہ ایک ایسی چابی ہوتی ہے جو ہر قفل کو کھول دیتی ہے دوسرے لفظوں میں ایک ایسا جنتر منتر جس کے سامنے دیوار در ہو جاتی ہے۔ دل چاہے تو ساتھ والوں کا سکوٹر کھول کر لے جائیے، رات کو میڈیکل سٹور بند ہے اور سر درد کر رہا ہے، شٹر اٹھائیے اور پیناڈول کھا لیجیے۔ یعنی ایک چیز اور کتنے فائدے میرے عزیز۔

آج ایسی ہی ایک کار آمد شے سے آج میں آپ کو متعارف کروانے جا رہا ہوں، جو ''ماسٹر کی'' تو نہیں مگر اُس کی طرح اس کے بھی لاتعداد استعمالات ہیں۔ اسے اُردوئے معلٰی میں ''دست پناہ'' کہا جاتا ہے۔ اس نام کی غالب وجہ یہ ہے کہ اس کے آگے سبھی دست بستہ جان کی پناہ مانگتے پھرتے ہیں۔ بچوں کے دل اس کی صورت دیکھ کر دہل جاتے ہیں اور اس کی موجودگی میں میاں اپنی بیوی کے سامنے بڑبڑانے کی جسارت بھی نہیں کرتے۔ آپ حیرانی کے سمندر میں ڈوبے اس وقت یہ سوچ رہے ہوں گے کہ بھلا ایسی خطرناک چیز کیا ہو سکتی ہے، تو میں بتاتا چلوں۔۔۔ ''لوک بھاشا'' میں اس کا نام چمٹا ہے!

آج کی نسل شاید اس اوزار سے ناواقف ہو، مگر ماضی قریب میں گھروں میں چمٹے کا بہت استعمال ہوتا تھا۔ صبح سویرے سبھی ننھے منے چنے پیڑھیاں لے کر چولہے کے گرد بیٹھ جاتے اور اماں جان ایک ایک کر کے تازہ تازہ پھلکے اُتارتی جاتیں۔ چکنے بیلنے سے گول گول پیڑے کو چودھویں کے چاند کی شکل دی جاتی اور پھر اسے توے پر ڈالا جاتا، چند لمحے انتظار کے بعد اسے چمٹے کی مدد سے ہلکا ہلکا اکھیڑ کر پشت پر ڈالا جاتا، جب ذرا پک جاتی تو توے کو کنارہ کر کے گرما گرم آگ پر روٹی کو چمٹے کے سہارے پکڑ کر سینکا جاتا، اور یوں مزیدار پھلکے تیار ہوتے۔ ساتھ ہی اگر کسی بھائی کا دل چرایا اور اس نے ساتھ بیٹھی گڑیا کی پونی کھجور کا درخت کہہ کر کھینچ ڈالی تو اس سے وہیں چمٹے سے حساب بے باق کر لیا جاتا تھا اور اگر ابا جی کچھ غلط کر بیٹھتے تو گھریلو تشدد کے سلسلے میں چمٹا ہی زنانہ ہتھیار کا کام دیتا تھا۔ الغرض چمٹا گرہستن خواتین کا وہ خاص ہتھیار تھا، جس سے وہ اپنا الو سیدھا کرتی ہیں، اور اگر الو سیدھا ہونے سے انکار کر دیتا تو اسے چمٹا مار مار کر سیدھا کر دیتیں۔

مگر اب ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

چمٹا آج کل دستکاری کی نمائشوں میں نظر آتا ہے، سکول کالجز یونیورسٹیوں میں جب علاقائی ثقافتی ایام منائے جاتے ہیں تب سٹالز پر چمٹے دکھائی دیتے ہیں۔ بچے بڑی حیرانی سے ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے اور کوئی میڈم جب انہیں بتاتی ہے کہ بچو! زمانۂ قدیم میں جب انسان نے ترقی نہیں کی تھی، تب وہ اس کے سہارے روٹیاں پکایا کرتا تھا تو ''کپ کیک'' جیسے گھونگلو بچے تاسف سے چمٹے کو دیکھ کر سوچتے ہیں کہ وہ وقت کتنا مشکل ہوتا ہوگا۔

چمٹا ایک ایسا اوزار ہے جو ہزار جگہ استعمال کیا جاسکتا ہے، مکئی کی چھلیاں بھوننے میں آج تک چمٹے سے کارآمد کوئی شے بنی نوع انسان ایجاد نہیں کرپائی، راقم نے خود چھلی میں سیخ کھبو کر بھوننے کی کوشش کی ہے، مگر جس آرام وسکون سے چمٹا یہ کام سرانجام دیتا ہے وہ بات کسی اور اوزار میں کہاں۔

چمٹے کا ذرا اُس کے ہم عصر اوزاروں سے موازنہ تو کیجیے۔ کیا رنچ، کیا پلاس، کیا زنبور! ایک تو ان اوزاروں کے نام دیکھیے، جیسے فرنگیوں کے ''ڈِنگے چِتے'' نام ہوں۔ فرنگی خود چلے گئے اور رنچ پلاس چھوڑ گئے۔۔۔ ہونہہ! دوسرا خوبصورتی میں کوئی اس کے ہم پلہ نہیں۔ چمٹے کے حسن پر ذرا غور کیجیے، سبحان اللہ۔۔۔ پتلی کمر، صراحی دار گردن اور سر پر ایک گول سا ہالہ جیسے تاج پہن رکھا ہو! رنچ ہو کہ زنبور، کام لیتے وقت بے وجہ چوں چراں کرتے چلے جاتے ہیں، لیکن آفرین ہے چمٹے پر کہ یہ چھنک چھنک کر کام کرتا جائے گا۔ نہ اسے رنچ کی طرح چوڑی چڑھانے کی ضرورت ہے نہ پلاس کی طرح یہ بھاری ہے، یہ تو بس اپنے کام سے کام رکھنے والا سیدھا سادھا سانولا سلونا اوزار ہے۔ غالبًا اسی لئے یہ اوزاروں کا بادشاہ ہے اور جیسے ہم دنیا والے بادشاہوں کو عالم پناہ کہتے ہیں، اوزاروں کے ہاں اسے ''دست پناہ'' کہا جاتا ہے۔

چمٹا صرف ''وجایا'' نہیں جاتا، بجایا بھی جاتا ہے۔ پنجاب میں اس کا بطورِ آلۂ موسیقی کافی رواج ہے اور فوک میوزک میں اِس کا استعمال ہوتا ہے۔ گاؤں کی چوپال میں سرِ شام چھڑکاؤ کے بعد لگتی بیٹھک اور اس میں چمٹے کی لے پر ہیر سننا۔۔۔ کیا مزیدار نظارہ ہوتا ہوگا۔ اب نہ وہ دور رہا نہ وہ گاؤں نہ ہی وہ بیٹھکیں۔

اب ڈھونڈ انہیں چراغِ رخِ زیبا لے کر

چمٹے بڑے شہر کی سڑکوں پر بھی نظر آ جاتے ہیں، کسی خواجہ سرا کے ہاتھوں میں جو انتہائی بے دردی سے گاڑی کے شیشے پر ہاتھ مارتا ہے اور آپ جلدی سے شیشہ نیچے کرتے ہیں کہ اگلا وار چمٹے کا نہ ہو جائے اور وہ آپ سے چند روپوں کا طلب گار ہوتا ہے، اور اس دھڑلے سے مانگتا ہے جیسے قرضہ واپس مانگ رہا ہو۔ آپ پیسے دے دیتے ہیں تو چمٹا بجا کر آپ کے پیاروں کو دعا دی جاتی ہے وگرنہ چمٹے کی لے پر آپ کا اللہ کو پیارا ہونے کی التجا کرتا ہے۔

ہماری ماؤں نے نسلوں کو چمٹے کی ضرب سے سدھارا ہے۔ تاریخ گواہ ہے جب تک گھروں میں چمٹے کا راج رہا، بچے اخلاقیات، روایات، رسوم ورواج سے چمٹے رہے، اور جیسے ہی چمٹے غائب ہوئے مادر پدر آزادی کے دن آ گئے۔ سو یہ تحریر پڑھنے والی ماؤ! اپنے اپنے گھروں میں چمٹے واپس لے آو، دیکھنا کیسے پھٹی ہوئی جینز، ہاتھ میں ڈلے رنگز، سنہری بال گم ہوتے ہیں اور اس کی جگہ ملے گا آپ کو اپنا اصلی والا بچہ۔ بچوں کی بے راہ روی سے آزردہ خواتین اگر ان پر چمٹے کا استعمال کریں تو کئی ''چمٹی'' ہوئی برائیوں سے آپ کے بچے محفوظ رہ جائیں گے۔

اس شعر کے ساتھ تحریر کا اختتام کرتا ہوں کہ ؎

چمٹا ہاتھ میں پکڑ کر، بجایا جا سکتا ہے
اب بھی جلتا شہر بچایا جا سکتا ہے!

فہد خان یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور میں سال سوم کے طالبعلم ہیں۔ لٹریری سوسائٹی، یو ای ٹی کے ادبی مجلّے ''ردائے سخن'' کے نائب مدیر ہیں۔ اُردو سے محبت کرتے ہیں اور انگریزی سے مشقت! مزاج میں مزاح کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، چنانچہ لکھنے لکھانے کے کام میں بھی اِسی مزاج کا دخل ہے۔ چلبلاہٹ اور بیساختگی اِن کے اندازِ تحریر کا طرۂ امتیاز ہے۔ اب تک بے شمار مضامین لکھ چکے ہیں، خصوصاً بچوں کا اسلام، ارمغانِ ابتسام اور الف کتاب پر افسانے اور مزاح آتا رہتا ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

ڈاکٹر پروفیسر مجیب ظفر انوار حمیدی

ایک سیاستدان سے انٹرویو

یہ ہمارے ملک کے معزز سیاستدان ہیں۔ یہ اپنے شعبے میں ایک منجھے ہوئے سیاستدان ہیں اور سیاست اس قدر ڈوب کر کرتے ہیں کہ اچھائی برائی کی تمیز نہیں کرتے، جس کی وجہ سے ان میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک کامیاب سیاستدان میں ہونا چاہئیں۔ ہم نے یہ انٹرویو سوال جواب کی شکل میں ترتیب دیا ہے۔ آئیں پڑھتے ہیں کہ کیا سوال کیے گئے اور تر کی بہ تر کیا جواب ملا۔

آپ ملکِ عزیز کے کامیاب سیاستدان ہیں، سب سے پہلے یہ بتائیں سیاست میں کس طرح وارد ہوئے؟

مجھے بچپن سے ہی مقابلہ کی عادت تھی اور جھوٹ کی بھی پھر محلّہ داری میں کسی کے خلاف بولنا ہوتا تو میری خدمات لی جاتی تھیں بس یہی عادت سیاست میں لے آئی۔

آپ آج جس مقام پر ہیں، یہ سب آپ نے اپنی محنت سے حاصل کیا ہے یا اس میں کسی کی دعاؤں کا بھی دخل ہے؟

جی میری محنت کا دخل تو یقیناً ہے لیکن دعا کا دخل بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ میری دادی نے مجھے سیاستدان کہا تھا۔۔۔ ٹھہریئے میں آپ کو پورا واقعہ سناتا ہوں۔ ایک بار میری دادی کو کافی دن سے بخار تھا اور وہ میرے بڑے بھائی صاحب کو کافی دن سے کہہ رہی تھیں کہ ڈاکٹر کے پاس لے جائیں لیکن وہ نہیں لے گئے ایک دن غصہ میں چلا رہی تھیں کہ میری کوئی خبر گیری نہیں کرتا۔ مجھے اچھی نہیں لگی اُن کی بے بسی، میں نے وعدہ کیا اب ایسا نہیں ہوگا، میں آپ کی قدر کروں گا اور ہر بات مانوں گا۔ وہ خوش ہوگئیں اور کہا اِس گھر میں تم ہی ہو جو میرا خیال رکھتے ہو۔ لیکن ہوا یوں کہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے میں بھی اُن کو ہسپتال لے جانا بھول گیا۔ جس پر اُنہوں نے کہا ''بیٹا تم تو سیاستدان کی طرح صرف بیان ہی دیتے ہو، عمل نہیں کرتے۔'' بس شاید وہ قبولیت کی گھڑی تھی میں سیاستدان ہی بنا۔ یہ میری دادی کی دعا ہے کہ آج میں کامیاب سیاست دان ہوں۔

آپ نے سیاست کی شروعات کہاں سے کی؟

اپنی گلی سے۔۔۔ پوری بات سنیئے! ایک بار جب میں سکول میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا تو مجھے خیال آیا کیوں نہ اپنے گھر کے باہر سیڑھیاں بنوائی جائیں کیوں کہ گلی نیچی تھی اور دروازہ کافی اونچا تھا، جس سے گھر میں داخل ہوتے وقت دقت ہوتی تھی، چنانچہ میں نے محلّہ والوں سے رقم اکھٹی کی کہ گلی پکی کرانی ہے۔ سب نے چندہ دیا میں نے گلی پکی کرائی اور میرے اپنے گھر کی سیڑھی بھی مفت میں بن گئی یوں محلّہ میں، میں ایک لیڈر بن گیا سب مجھے اہمیت

آپ بیتی لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ اس لئے نہیں کہ سچ بولنا پڑتا ہے بلکہ اس لئے کہ "چیزے دگر" کو سچ کے نام سے پیشکرنے کے لئے بڑی محبت کرنی پڑتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اکثر آپ بیتیاں لکھنے والوں کے نامہ ہائے اعمال کا محرف ایڈیشن بن جاتی ہیں۔

خامہ بگوش از مشفق خواجہ

دینے لگے جس سے سیاست کے جراثیم مجھ میں سرایت کرتے چلے گئے ویسے بھی اس کام میں عزت بھی ہے اور شہرت بھی۔

اچھا اب یہ بتائیں آپ نے ملک وقوم کے لئے کیا خدمات انجام دی ہیں؟

ملک کے لئے۔۔۔ ہاہاہاہا۔۔۔ ارے بھائی ہمیں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے بڑے جو کام کر گئے ہیں، بہت ہے۔ اُن کی قربانیاں کیا کم ہیں۔ اب تو صرف ملک کو ہی کچھ کرنا چاہیئے ہمارے لئے، میں سمجھتا ہوں، ہمارا ملک ایک پھل دار درخت ہے جس کو ہمارے بزرگوں نے ہمارے لئے لگایا تھا۔ اب ہمیں صرف اس کا پھل کھانا ہے۔ ویسے میں نے ملک کو تین بیویاں اور آٹھ بچے دیئے ہیں اور کافی مدد کرتا ہوں ان کی۔ ہر طرح کی سہولیات دی ہوئیں ہیں ان کو۔۔۔ وہ بھی اِس ملک کے شہری ہیں۔ اُن کی خدمت بھی تو ملک قوم کی خدمت ہوئی ناں بھئی!

چلیں اب یہ بتائیں کہ ملک نے آپ کو کیا دیا؟

یہ سوال تو میرے خیال میں ذاتی سا ہے لیکن جواب دیتا ہوں۔ آپ ان باتوں کو آف دی ریکارڈ ہی رکھیئے۔ ملک نے مجھے قیمتی پلاٹس، فیکٹریز، بے شمار زرعی زمینیں دی ہیں۔ ویسے اِن میں میری محنت اور ذہانت کا بھی کمال ہے۔

ایک شکایت آپ سے لوگوں کو رہتی ہے کہ آپ الیکشن میں ہی صرف اپنے حلقہ میں جاتے ہیں بس؟

جی درست فرمایا آپ نے روز روز کا ملنا قدر کھو دیتا ہے، اس لئے میں کبھی کبھی ہی جاتا ہوں۔ پھر دنیا کا دستور ہے کہ صرف اپنا کام ہو تو رابطہ رکھا جائے، ایسے بلا مقصد کیوں کسی سے ملا جائے بغیر الیکشن مہم کے کیا ضرورت ہے کسی سے ملنے کی۔

آپ نے کبھی کوئی ایسا کام بھی کیا ہے جسے کرنے پر آپ کو فخر ہو کہ آپ کی وجہ سے دکھی انسانیت کی خدمت ہوئی ہے؟ کوئی سوشل ورک وغیرہ؟

جی جی میں ایسے کام اکثر کرتا ہوں۔ میری وجہ سے لوگ اپنے بھولے ہوئے رشتہ داروں کو یاد کر لیتے ہیں۔

وہ کیسے؟

میں بتاتا ہوں۔۔۔ ہمارے محلّہ میں ایک صاحب کے والد کا انتقال ہو گیا تھا دو سال پہلے۔۔۔ اب الیکشن آئے تو مجھے یاد آیا اب اچھا موقع ہے اِن سے تعزیت کرنے کا، میڈیا میں خبر جائے گی، نیک نامی ہو گی تو میں بغیر کسی سیکورٹی کے ان کے گھر پہنچ گیا، افسوس کرنے کے لئے۔۔۔ وہ صاحب بھول چکے تھے اپنے والد کی فوتگی کو۔۔۔ میرے جانے پر ان کو یاد آیا۔ اِس طرح یہ نیکی کا کام میرے ذریعے ہوا۔۔۔ ماشاللہ۔۔۔ ایسے کام تو چلتے رہتے ہیں۔

آپ پر ایک اور الزام ہے کہ آپ ٹیکس نہیں دیتے، قرضے معاف کرا لیتے ہیں۔ ملکی دولت ایک خاندان میں ہی بٹتی جاری ہے جب کہ اس دولت سے کئی خاندانوں کی کفالت ہو سکتی تھی۔

نہیں جی۔۔۔ آپ کی بات بالکل غلط ہے۔ ایک کے ہاتھ میں کس طرح رہے گی دولت۔۔۔ میری ماشا اللہ کافی اولادیں ہیں، اُن میں تقسیم ہو گی۔۔۔ پھر کارخانوں میں کافی لیبر ہیں، اُن کا مستقل ذریعۂ معاش ہماری وجہ سے ہے۔ اِسی طرح جتنا میری جائداد بڑھتی ہے، مجھے اُتنے ملازم رکھنا پڑتے ہیں، جس سے کافی لوگوں کو روزگار مہیا ہوتا ہے۔

عام طور پر یہ تاثر ہے کہ آپ حکومت میں ہوں تو خوش باش چست دکھائی دیتے ہیں، دوسری صورت میں آپ کی شخصیت بالکل بدل جاتی ہے؟

آپ انسان ہیں یا پتھر؟ ایسے سوال کرتے ہیں ایک انسان کو جو مرسیڈیز کی لائن لگا کر باہر نکلتا ہو، جلوس کی شکل میں۔۔۔ ہوائی جہاز ایک اکیلے بندے کے لئے مخصوص ہو جس کی خبریں سرگرمیاں، ٹی وی پہ ہیڈ لائن بنا کر چلائی جائیں جو چہل قدمی کے لیئے باہر نکلے تو ایک خبر بن جائے پھر ایک دم اس کو جیل میں ڈال

دیا جائے اور اس سے سوال شروع کر دیے جائیں کہ کتنی رقم لوٹی؟ کہاں کی؟؟ کیا کیا جائدادیں بنائیں؟؟؟ اب وہ بچارہ ڈسٹرب نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا۔

اس کا مطلب ہے آپ احتساب کے بالکل خلاف ہیں؟

جی بالکل صحیح کہا ہے آپ نے۔۔۔ دیکھیں ہم مسلمان ہیں، اللہ نے قیامت قائم کرنا ہے۔۔۔ جزا سزا لے لئے۔۔۔ پھر قبر میں بھی حساب کتاب ہونا ہے، تو آخر پھر مرنے سے پہلے کیوں حساب دیں؟ حساب کا حق صرف اللہ کو ہے، وہ لے گا ہم سے، جب مر گئے تو ویسے کیوں مریں ہم۔۔۔ مریں ہمارے دشمن۔۔۔ میں ایسے جذباتی ہوگیا۔

آپ جب جیل ہوتے ہیں تو کھانا جیل کا ہی کھاتے ہیں کیا؟

اچھا سوال ہے۔۔۔ کیا مجال میرے دشمنوں کی کہ میرے ساتھ عام آدمی والا سلوک کریں۔ میں اپنا باورچی ساتھ رکھتا ہوں۔۔۔ ویسے اکثر تو میرے گھر کو ہی سب جیل قرار دے کر مجھے گھر میں ہی نظر بند کیا جاتا ہے۔

آپ غیر ملکی دورے پر جاتے ہیں تو ملک وقوم کے مفاد میں کیا کام کرتے ہیں؟

جی بتاتا ہوں۔۔۔ میں جب بھی غیر ملکی دورہ پر جاتا ہوں تو اپنے ساتھ اپنے خاندان کے دوستوں کے ساتھ جاتا ہوں۔۔۔ جیسے اس دفعہ جب گیا تھا تو کوئی ستر کے قریب افراد میرے ساتھ تھے جو بچارے کبھی جہاز میں نہیں بیٹھے تھے، نہ کسی غیر ملک کا سفر کیا تھا، نہ ہی وہ کبھی سوچ سکتے ہیں۔۔۔ یوں میں نے اُن کی تفریح کا بندوبست کیا۔ اُن کی شاپنگ، خریداری کی رقم دی اُن کو جو بچارے اپنے ذاتی خرچ سے ساری زندگی نہیں کر سکتے تھے۔۔۔ یوں ستر سے زیادہ پاکستانیوں کا خواب میری وجہ سے پورا ہوا۔

پاکستان میں جہاد کا نام بہت لیا جاتا ہے۔ آپ کیا کہیں گے اس موضوع پر؟

جن لوگوں کی زندگی مشکلات کا شکار ہے، وہ ضرور کریں۔ دو فائدے ہوں گے۔۔۔ ایک تو ثواب مل جائے گا دوسرا زندگی ختم تو مشکلات ختم۔۔۔ ویسے میں تو ہر اس بندے کے خلاف جہاد کا قائل ہوں جو مجھ سے مخالف نظریات کا حامل ہے کیونکہ ایک دین ہی تو ہے جس کے نام پر ہم اپنی قوم کو ورغلا کر اُن سے جو کام چاہیں، لے سکتے ہیں۔۔۔ کیونکہ ہماری قوم کو اپنی دین کے بارے میں اتنی معلومات نہیں ہوتی۔۔۔ بس وہ سنی سنائی باتوں کو دین سمجھتے ہیں۔ قرآن کو سمجھتے تو ہیں نہیں، بس ثواب کی خاطر رٹ لیتے ہیں اور جو دین ان کو مولوی بتادے وہ ان کا عقیدہ بن جاتا ہے۔

آپ کو کھانے پینے میں کیا پسند ہے؟

ہر وہ چیز مجھے وہ پسند ہے جسے بے وقوف لوگ قوم کی امانت کہتے ہیں۔

جی میں نے کھانے پینے کی بات پوچھی ہے؟

میں بخوبی سمجھ گیا ہوں۔۔۔ رقم ہو گی تو ہی کھانے پینے کا بھی بندوبست ہوگا۔ میں نے شارٹ کٹ میں جواب دیا ہے۔

آپ کی عمر کیا ہے؟

میں آپ کو کتنے برس کا لگتا ہوں؟

۵۳ سال کے؟

تو پھر میں ۵۳ سال کا ہی ہوں۔

آخر میں یہ بتائیں کے آپ قوم کے نام کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

جی قوم کے لئے میں خود میری ذات سر سے پاؤں تک پیغام ہی پیغام ہے۔ قوم ہمیں دیکھتی رہے اور ووٹ دیتی رہے، بس یہی میرا پیغام بھی ہے حکم بھی اور نصیحت بھی۔

کراچی سے تعلق رکھنے والے پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی اُردو کے ایک بہت بڑے ادیب جناب انوار (عیگ) کے بہت بڑے صاحبزادے ہیں۔ یہ بچوں کے معروف ادیب ہیں۔ اب تک انہوں نے بچوں کے لئے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کہانیاں لکھ لی ہیں اور مسلسل لکھ رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب کے اندازِ بیان کا طرۂ امتیاز شگفتگی اور بیساختگی ہے۔ خصوصاً قلمی خاکے لکھنے میں تو ان کا جواب ہی نہیں۔ حالات و واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ تصویری بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کو فخر حاصل ہے کہ یہ اس کے لئے تسلسل سے لکھ رہے ہیں۔

ساجدہ غلام محمد

آپ صاحب ذوق نہ بھی ہوئے تب بھی شعر ضرور سُن رکھا ہوگا ۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اِس کارگہِ شیشہ گری کا

انگلینڈ آ کے شک ہوا کہ شاعر پہ اِس شعر کی آمد غالباً برطانیہ کے گھروں کو دیکھتے ہی ہوئی ہوگی۔ ہم آئے تھے پاکستان سے، جہاں پکے سیمنٹ والے فرش کا چپس تھوڑا سا بھی اکھڑا ہو تو وہاں بادام اور اخروٹ پھنسا کے توڑے جائیں، اتنی مضبوط دیواریں کہ پانچ چھ فریم آرام سے لگ جائیں اور اتنی مضبوط چھتیں ہوتی ہیں کہ دو پنکھے لگ کے فل سپیڈ میں گھوم سکتے ہیں (بشرطیکہ بجلی ہو)۔ اور یہاں کے گھر! فرش پہ لکڑی بچھی ہے، کوئی آدھی رات کو چپکے سے اٹھ کے کچن میں جا کے بریانی کی پتیلی میں سے آلو نکال کے نہیں کھا سکتا کہ آپ کا ایک ایک قدم جہاں جہاں پڑے گا، فرش سے با آواز بلند ایسی "چوں چوں" کی آوازیں آئیں گی کہ پورے گھر کو علم ہو جائے گا آپ کے ارادے کیا ہیں۔ حد ہی ہو گئی یعنی کہ!! آپ یقین کریں، ہم بالکل بھی مبالغہ نہیں کر رہے، جو لوگ برطانیہ میں رہتے ہیں، وہ سب گواہ ہیں کہ اپنے کمرے میں بیٹھے سب پتا چل رہا ہوتا ہے کون جا رہا ہے، کون آ رہا ہے۔ عموماً یہاں دو منزلہ گھر ہوتے ہیں، سونے کے کمرے اوپر کی منزل میں اور کچن اور ایک بڑا کمرہ یا دو چھوٹے کمرے نیچے۔ آپ چاہے فرش پہ قالین بچھا لیں، چاہے بہترین کوالٹی کی لکڑی، جب بھی چلیں گے، فرش سے ایسی آہ و بکا سنائی دے گی کہ نہ پوچھیں۔ ہم بھی بڑے عقلمند ہیں، ہمیں بھی اندازہ ہو گیا ہے کہ فرش کے کن حصوں پہ قدم رکھنے سے زیادہ آواز آتی ہے، سو ان حصوں سے اس وقت تو ہر صورت ہی بچتے ہیں جب آدھی رات کو بھوک ستائے!!

چھت کی نزاکت بھی خوب ہے! یہاں گھروں میں دوسری منزل کے اوپر ایک چھوٹا سا سٹور سا بنا ہوتا ہے جسے attic کہتے ہیں، چاہے تو سارا کاٹھ کباڑ وہاں گھسا دیں، چاہیں تو ذرا پیسہ لگا کے اسے کمرے کے طور پر استعمال کر لیں۔ ایک دفعہ ہمارے سسر جی کسی کام سے اوپر attic میں گئے، attic کے عین نیچے ساس امی اور سسر جی کے سونے کا کمرہ ہے، ابھی سسر جی اوپر چڑھ کے کچھ ڈھونڈ ہی رہے تھے کہ "دھم" کی آواز آئی! Attic کا فرش میرے دھان پان سے سسر جی کا وزن نہیں سہار سکا تھا اور attic کے فرش یعنی ساس سسر کے کمرے کی چھت پہ ایک سوراخ ہو گیا تھا! ارے آپ یہ تو نہیں سمجھے کہ سسر جی نیچے آ گرے تھے؟؟ ارے نہیں، صرف پاؤں ہی کی طرف کا فرش اکھڑا تھا! اب آپ ہی

بتائیں کہ اتنی نازک چھتوں پہ پنکھے لگیں تو کیونکر ٹکیں؟؟ گرمیوں میں حال بُرا ہو جاتا ہے جب حبس بھی ہو۔ گوروں کی ایک اور عقلمندی، کھڑکیوں پہ بس شیشہ ہوتا ہے، پاکستان میں تو جالی بھی لگی ہوتی ہے، لوہے کی سلاخیں بھی اور شیشہ بھی۔ یہاں بس شیشہ ہی ہوتا ہے، اگر گرمی سے گھبرا کر آپ سارے گھر کی کھڑکیاں پوری کھول دیں تو پھر آپ کو نچلی منزل پہ ہی رہنا پڑتا ہے، ہر ایرے غیرے کو دعوتِ عام جو مل رہی ہوتی ہے اندر آنے کی، کوئی بھی آرام سے کھڑکی کے ذریعے اندر آ سکتا ہے! کوئی ایک مشکل تھوڑی ہے!! بندہ جالی ہی لگا دیتا ہے کھڑکی پہ! ہر طرح کے کیڑے، خصوصاً بڑی بڑی مکڑیاں اندر آ جاتی ہیں جنہیں مارتے ہوئے میاں ہمیں بھی مار دینے والی نظروں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کھڑکیاں بند رکھو، لو اب بندہ کھل کے سانس بھی نہ لے!!

چھوٹے بچوں کا ساتھ ہو تو جالی والی کھڑکی کی عدم موجودگی مزید خطرناک ہو جاتی ہے۔ ہمارے چھوٹے صاحبزادے شاید سال کے تھے۔ ہم نے کہیں جاتے ہوئے اپنے کمرے کی کھڑکی پوری کھول دی تا کہ کمرے میں ذرا تازہ ہوا آ جائے۔ واپس آئے تو صاحب زادے پہ نظر نہ رہی۔ وہ فوراً اوپر کمرے کی طرف چلے گئے۔ وہ تو اللہ کا بے انتہا شکر کہ میاں جی کسی کام سے اوپر گئے تو دیکھا کہ بیٹا بستر کے ذریعے کھڑکی کی سل پہ بیٹھ کے، آدھا کھڑکی سے باہر لٹکا، کھڑکی بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا! میاں نے فوراً اسے پیچھے کھینچا اور ایک بار پھر ہماری کلاس ہوئی!!! بیشک اللہ ہی

ضیاء الحق قاسمی معروف کالم نگار عطا الحق قاسمی کے بڑے بھائی تھے۔ اُنہوں نے عالمی طنزیہ و مزاحیہ مشاعروں کے مسلسل انعقاد کے سلسلے میں خاصی شہرت پائی۔ اپنی کتاب ''مجھے یاد آیا'' میں لکھتے ہیں۔ ''دبئی کے عالمی مشاعرے میں پاگل عادل آبادی غزل سُنا رہے تھے اور مشاعرہ لُوٹ رہے تھے۔ اُن کے اس شعر پر داد کا غوغا چھت پھاڑ قسم کا ہونے لگا۔

جن کے ہاتھوں پہ ہے گھڑی سیکو
وہ نہیں جانتے بجا کیا ہے

راغب مرادآبادی کمپیئرنگ کر رہے تھے، اُنہوں نے برجستہ کہا۔

داد پاگل کو تم جو دیتے ہو
عقلمندو ! تمھیں ہوا کیا ہے

سب کی حفاظت فرماتے ہیں. ابھی بھی وہ واقعہ یاد آ رہا ہے تو دل کو کچھ ہو رہا ہے!!

ہم سب گھر والوں نے اپنے اپنے کمروں میں سٹینڈ والے پنکھے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ نہ ہوں تو سب کو پتا چل جائے کہ کون کس کی کتنی غیبت کر رہا ہے!!

ایک دفعہ بیٹے کو ایک چھوٹی سی نرسری لے کے گئے۔ وہاں استقبالیہ والے حصے میں چھت پہ پنکھا لگا دیکھ کے ہمیں تو خوشی ہوئی، بیٹے نے حیرت سے دیکھ کے پوچھا، ''یہ کیا ہے؟؟؟''

ہم تو اس بیچارے کو وہ نظم بھی نہیں سنا سکتے۔

اوپر پنکھا چلتا ہے
نیچے منا سوتا ہے!

پاکستان گئے تو وہاں بیٹے کا پسندیدہ مشغلہ چھت والے پنکھے کو چلانا اور بند کرنا تھا!

یہاں کے گھروں کا ایک اور بھی مسئلہ ہے۔ دروازوں کا تنگ ہونا۔ پاکستان میں تو دلہن اپنے سسرال بعد میں آتی ہے، اس کے جہیز کی بڑی بڑی پیٹیاں پہلے پہنچ جاتی ہیں۔ یہاں آپ ایک بڑی میز کو بغیر آڑھا ترچھا کیے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں منتقل کر کے دکھا دیں تو ہم آپ کو مان جائیں!!! اگر آپ نے کوئی سامان خریدا ہے، چاہے وہ بیڈ ہے، چھوٹی سے چھوٹی میز، یا بڑی سے بڑی الماری، سامان آپ کو دے دیا جائے گا، آگے اُسے جوڑنا آپ کا کام۔ ہمارے گھر میں ایک کمرے سے الماری اور بیڈ اس کے بالکل ساتھ والے کمرے میں منتقل کرنا تھا، مسئلہ تھا کہ دونوں کمرے بالکل برابر میں تھے، اگر سیدھ میں ہوتے تو شاید اتنا دردِسر نہ ہوتا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ بیڈ اور الماری، دونوں کو بالکل پورا کھولا گیا، یہاں تک کہ ایک ایک حصہ الگ ہو گیا۔ پھر دوسرے کمرے میں سارے لوازمات لے جائے گئے اور وہاں دوبارہ سے ان لوازمات کو الماری اور بیڈ کی شکل دی گئی۔ یعنی جو کام پاکستان میں زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں ہو جانا تھا، وہ یوکے میں سات آٹھ گھنٹوں میں جا کے ہوا!!

یہاں اگر ایک بچے کے کپڑے چھوٹے ہو جائیں تو آپ ''اگلے منے'' کے لیے نہیں سنبھال کے رکھ سکتے، ان کپڑوں کو سنبھال کے رکھنے کی جگہ ہی نہیں ہے!!! ہر کمرے میں بستر کے نیچے ہی سوٹ کیس اور بیگ رکھنے پڑتے ہیں کہ کچھ گھروں میں تو ایک سٹور بھی نہیں ہوتا۔ ارے نہیں، سارے گھر ''مرغی کے دڑبے'' جتنے چھوٹے نہیں ہیں، خصوصاً جو پرانے بنے ہوئے گھر ہیں، وہ کافی بڑے اور کشادہ ہیں۔ باہر سے تو کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ اندر رہنے والے مکین کتنے صاحبِ استطاعت ہیں کہ دیکھنے میں سارے گھر ایک جیسے لگتے ہیں، اندر جائیں تو پتا چلتا ہے!!

بس ایک بات ہے، گھر برطانیہ کے ہوں یا پاکستان کے، چھوٹے ہوں یا بڑے، بس دل لگنا چاہیے اور دل تو ہر اس جگہ پہ لگ جاتا ہے جہاں اپنے پیارے ہوں، سو، اب ہمارا دل پاکستان میں بھی لگتا ہے اور برطانیہ میں بھی، چاہے برطانیہ میں ہمارا چھوٹا گھر ہے لیکن ''گھر تو آخر اپنا ہے!'' الحمدللہ۔

ساجدہ غلام محمد کا تعلق پاکستان سے ہے لیکن کئی برسوں سے انگلستان میں مقیم ہیں۔ کہانیاں لکھنے میں کمال رکھتی ہیں۔ بچوں کے ادب سے لگاؤ ہے۔ اندازِ تحریر نہایت جاندار اور شگفتہ ہے۔ اپنے انگلینڈ میں موجود واقعات کو نہایت چلبلے اور بیساختہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کی خصوصی کرمفرما ہیں۔

خادم حسین مجاہدؔ

جہاز

اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جہاز تو نہایت بے وقوف ہوتے ہوں گے تو یہ آپ کی بھول ہے۔ اگر آپ ان کی باتیں سنیں تو آپ کو ان سے عقل مند آدمی مل ہی نہیں سکتا۔

عنوان سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ کوئی سائنسی مضمون ہے جو امریکہ، جرمنی، فرانس یا جاپان کے بنے ہوئے جہازوں پر لکھا گیا ہے بلکہ میرا یہ مضمون تو دیسی قسم کے جہازوں پر ہے اور افغانستان، بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش ایسے جہازوں کی تیاری اور برآمد میں خود کفیل ہیں، یہ جہاز ان تمام ملکوں کے تمام شہروں، دیہاتوں اور گلی محلوں میں وافر مقدار میں موجود ہیں یہ عام طور پر کھیرا کنڈیوں ویران اور زیرِ تعمیر عمارات اور پارکوں میں پائے جاتے ہیں۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میری مراد ان جہازوں سے ہے جو نشہ کا پٹرول ملنے سے پرواز کرتے ہیں ورنہ اپنے بنکرز پر گراونڈ ہی رہتے ہیں۔ ان کو سیسنا، ایف سولہ، راکٹ اور میراج بھی کہتے ہیں۔ یہ ہر قسم کا نشہ کرنے کو تیار رہتے ہیں چرس، ہیروئن اور یہ نہ ملیں تو ٹیکہ سے کام چلا لیتے ہیں۔

عام طور پر انسان اپنے وزن کے برابر بوجھ اٹھا سکتا ہے لیکن جب ان جہازوں کو نشے کی طلب ہوتی ہے اور جسم ٹوٹ رہا ہو تو یہ اپنے سے دگنا وزن بھی اٹھا لیتے ہیں بشرطیکہ ان کو اتنی رقم مل جائے جس سے وہ نشے کی ڈوز لے سکیں۔ اس کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ طلب شدید ہو تو ہمت اور طاقت دگنی ہو جاتی ہے یہ جہاز اپنی طلب پوری کرنے کے لئے شروع شروع میں اپنے گھروں کا صفایا کرتے ہیں پھر ہمسایوں اور رشتہ داروں، محلّہ داروں اور علاقے والوں کے گھروں اور دکانوں کا پھر جب سب ان سے ہوشیار ہو جاتے ہیں تو سرکار ان کا نشانہ بنتی ہے کتنی ہی نہریں ہیں جو انہوں نے گنجی کر دی ہیں اور کتنی ہی پرانی سرکاری عمارتوں کا میٹیریل یہ بیچ کر کھا چکے ہیں، گٹروں کے ڈھکنے، ٹونٹیاں، سائیکلیں، ڈش انٹینا کے ریسیور کچھ بھی ان کے ہاتھوں محفوظ نہیں، پولیس بھی ان کو نہیں پکڑتی کہ ان سے ملے گا کیا الٹا ان کو مرنے سے بچانے کے لئے نشہ پلے سے دینا پڑے گا۔

اچھے بھلے انسان جہاز کیسے بن جاتے ہیں اس کی کئی وجوہات ہیں کچھ دنیاوی مسائل سے فرار حاصل کرنے کے لئے تو کچھ منہ زور جوانی کا نشہ ڈبل کرنے کے لئے جہاز بنتے ہیں، کچھ کو بُری صحبت اس انجام تک پہنچاتی ہے تو کچھ کو تباہ و برباد کرنے کے لئے بطور سازش بھی جہاز بنا دیا جاتا ہے، کچھ عورتوں کی وجہ سے اپنی زندگی برباد کر لیتے ہیں، ہر صورت میں جہاز بنتے ہی انسان کی عزت، مال، جائیداد، اور معاشرتی تعلقات سب ٹھکانے لگ

ایک روز کسی شاعر نے مجتبیٰ حسین سے پوچھا "یہ کیا بات ہے کہ آپ نے صرف مرداد یبوں کے سراپے لکھے ہیں۔"
مجتبیٰ حسین نے برجستہ جواب دیا "دوسرے سراپے کے لئے غزل جو موجود ہے۔"

قلمکاروں کی خوش کلامیاں از نارنگ ساقی

جاتے ہیں وہ معاشرے پر ہی نہیں گھر والوں پر بھی بوجھ بن جاتے ہیں انسان ہوتے ہوئے وہ لینڈ لارڈ بن جاتے ہیں مگر جب نشے میں سب کچھ ہار کر جہاز بن کر مرتے ہیں تو گھر والے ان کی میت بھی قبول نہیں کرتے۔

دنیا میں ہر چیز کے نقصانات کے ساتھ کچھ فوائد بھی ہوتے ہیں، ہمارے علاقے سے اچھا قسم کا کینو اور مالٹا بڑے شہروں اور غیر ممالک کو بھیج دیا جاتا ہے جہاں وہ مہنگے داموں فروخت ہوتا ہے اور مقامی کاشتکاروں کو زیادہ فائدہ ہوتا ہے، مقامی مارکیٹ میں کینو مہنگے داموں بیچنا ناممکن ہوتا ہے کیونکہ یہاں تو لوگ مفت کھانے کے عادی ہیں اس کے نتیجے میں مارکیٹ میں سستا کینو دستیاب نہ ہوتا اگر یہ جہاز نہ ہوتے یہ مردانِ مجاہد سخت سردی میں دھند اور اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آدھی رات کو باغوں میں داخل ہوجاتے ہیں اور صبح ان کو نشہ اور عوام کو سستا کینو دستیاب ہوجاتا ہے اور جہاں کارپوریشن کا سسٹم نہیں ہوتا، وہاں کوئی بھی کسی قیمت پر گٹروں اور نالیوں کی صفائی پر تیار نہیں ہوتا، یہاں بھی یہی جہاز کام آتے ہیں اور نہایت کم مزدوری پر زیادہ سے زیادہ صفائی کر دیتے ہیں، اگر یہ نہ ہوتے تو سیوریج کے مسائل مزید بڑھ جاتے اس لئے ہم ان کے شکر گذار بھی ہیں۔

اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جہاز بیوقوف ہوتے ہوں گے تو یہ آپ کی بھول ہے اگر آپ ان کی باتیں سنیں تو آپ کو ان سے زیادہ عقل مند آدمی مل ہی نہیں سکتا، دوسرے ان کے پاس اکثر اوقات وقت وافر ہی ہوتا ہے اس لئے ان کے لیکچر مختصر نہیں ہوتے پھر انجکشن لگانے میں یہ ایسی مہارت حاصل کر لیتے ہیں جو ڈاکٹروں کو بھی اکثر نہیں ہوتی۔ جب بار ہا انجکشن لگانے کی وجہ سے ان کی بازوؤں کی رگیں ختم ہوجاتی ہیں تو یہ جسم کے نازک حصوں سے ایسی ایسی رگیں تلاش کر لیتے ہیں جن کا تصور بھی محال ہے اور ان کو وہاں ٹیکہ لگاتے دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

نشہ پورا کرنے کے لئے یہ خون اور گردے بیچ دیتے ہیں عموماً اان کی موت ٹیکے کے ری ایکشن یا سردی اور بھوک کے ایکشن کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس لئے سردیوں میں ان کی تعداد کم ہوجاتی ہے اور گرمیوں میں نئی بھرتی سے پھر بڑھ جاتی ہے۔ نئی بھرتی عموماً مفت کے سُوٹے لگوا کر کی جاتی ہے اس کے لئے کسی امیر کو تاڑا جاتا ہے اور جب تک وہ ان جیسا نہیں ہوجاتا۔ اس کے پلے سے پی جاتی ہے۔

ہم نے لاہور کے ایک معروف پارک میں جہاز کا ایک دلیرانہ حملہ دیکھا تو دنگ رہ گئے ۔ غالباً یہ جہاز نشے سے ٹوٹا تھا اس لئے اس نے پارک میں کھڑی سائیکل اُڑا لے جانے کی کوشش کی مگر بدقسمتی سے دو پولیس کانسٹیبلوں نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ ہمارا خیال تھا کہ جہاز پولیس والوں کی منت سماجت کرے گا لیکن اس نے جو کیا وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ اس نے ایک کانسٹیبل کو دھکا دے کر اپنی جیب سے بلیڈ نکالا اور لمحوں میں اپنا بدن جگہ جگہ سے چیر ڈالا۔ اتنا لہو بہتا دیکھ کر پولیس والے بھی گھبرا گئے اور لگے جہاز سے معافیاں مانگنے۔ انہوں نے اسے اپنے پلے سے اسے شربت بھی پلایا، آخر بڑی مشکل سے جہاز کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور اس نے پولیس والوں کو معاف کر دیا۔ ورنہ تو وہ اگلے مرحلے پر اپنی شہ رگ کاٹنے پر تُلا تھا۔ دیکھا آپ نے، یہ جہاز اکثر کریش لینڈنگ بھی کر جاتے ہیں۔

خادم حسین مجاہد کا تعلق سرگودھا سے ہے۔ موصوف بچپن سے ہی لکھتے آرہے ہیں۔ بچوں کے لئے بہت کچھ لکھا۔ شستہ اندازِ تحریر کے مالک ہیں۔ ظرافت نگاری کے ساتھ ساتھ ان کے طنز کی کاٹ سے بھی انکار ممکن نہیں۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ "ارمغانِ ابتسام" کی مجلسِ مشاورت میں شامل ہیں اور اوّلین شمارے سے اس کے ساتھ ہیں۔

محمد اشفاق ایاز
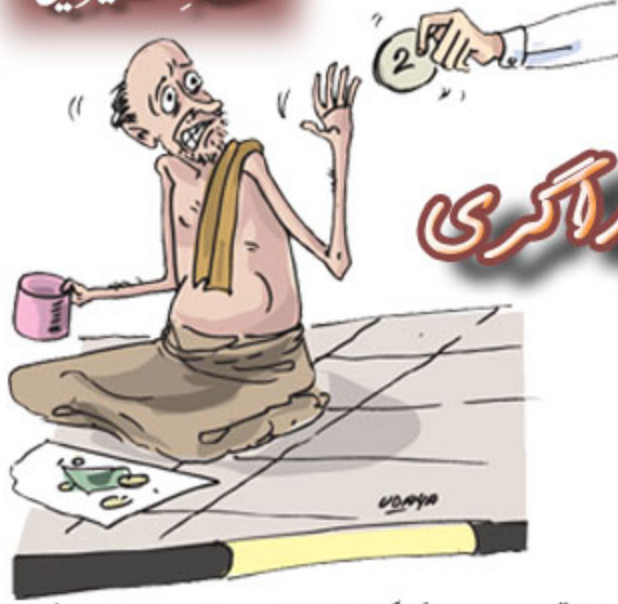
صنعتِ گداگری

ہمارا پیارا ملک پاکستان اگرچہ مجموعی طور پر ایک ترقی پذیر ملک ہے لیکن اس کے باوجود اس میں کچھ ایسی صنعتیں ہیں جن میں اس نے بتدریج ترقی کی ہے۔ ان میں ایک صنعت گداگری بھی ہے۔ گداگری کو صنعت کا درجہ اس پر سرمایہ کاری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کو مدنظر رکھ کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسی صنعت ہے جس میں علاقائی رسوم و رواج، ماحول اور وہاں رہنے والے باشندوں کو مدنظر رکھ کر سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔ اس سرمایہ کاری میں ایک کشکول، ایک لاٹھی، ایک ڈول، چند موٹے منکوں والی تسبیاں، ہرا چوغہ، ٹوٹی پھوٹی جوتی اور چہرے پر بے غیرتی کی جھلک نظر آنی چاہئے۔ پھر پیسہ خود بخود کھنچتا چلا آتا ہے۔ اتنی کم سرمایہ کاری پر اتنی کثیر آمدنی شائد ہی کسی دوسری صنعت میں ہو۔ پھر اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ کہ اس سے حاصل ہونے والا پیسہ ہر قسم کے ٹیکس سے مستثنٰی ہے۔ اس کے لئے وقت کی بھی قید نہیں۔ گداگر کسی بھی وقت کسی بھی جگہ کھڑے ہو کر، لیٹ کر، گھسیٹ کر، اندھے بن کر، لولے لنگڑے بن کر، مریض بن کر، سفر میں، حضر میں۔ الغرض موقع محل کی مناسبت سے جہاں سہولت میسر ہو گداگری کر سکتے ہیں۔

گداگری زمانہ قدیم سے جاری ہے۔ تاہم تاریخ میں اس کا کہیں ذکر نہیں کہ اس کی ابتدا کس خطے یا علاقے سے ہوئی۔ عام قیاس یہی ہے کہ اس کی ابتدا غریب ملکوں میں ہوئی ہو گی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے سرمائے میں اتنا پھیلاؤ آ چکا ہے کہ اب اسکے گداگر سرمایہ کار امیر ملکوں میں بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ جو روزانہ ہزاروں پونڈ، ڈالر، یورو وغیرہ اکٹھے کرتے ہیں۔ اس صنعت سے حاصل ہونے والے سرمائے کو غریب اور امیر ملکوں کے سرمایہ دار الگ الگ انداز سے خرچ کرتے ہیں۔ غریب ملکوں کے گداگروں کو ساری عمر اپنی ذات پر خرچ کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ جبکہ امیر ملکوں کے گداگر ہفتے میں پانچ دن سرمایہ اکٹھا کرتے ہیں اور دو دن عیاشی کے لئے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

ایک گداگر کو مختلف مقامات پر مختلف روپ دھارنے کی مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک گداگر ایک شہر میں اندھا بن کر دولت اکٹھی کر رہا ہے تو دوسرے شہر میں بھی اندھا ہی ہو۔ وہ دوسرے شہر یا جگہ لنگڑا، ٹی بی کا مریض، یا کوئی بھی روپ دھار کر میدان میں اتر سکتا ہے۔ ایک دن بازار میں ایک لنگڑا گداگر نظر آیا۔ مجھے شک گزرا کہ اسے تو میں نے دوسرے شہر میں اندھا بنے دیکھا تھا۔ میں نے اسے پکڑ کر جب وضاحت چاہی تو

وہ صاف مکر گیا۔ قسمیں کھانے لگا کہ وہ تو کبھی اس شہر گیا ہی نہیں۔ پھر اس دن کے بعد وہ ہمارے شہر نظر نہیں آیا۔

صنعت گداگری کی بھی مختلف قسمیں ہیں۔ اس میں آپ انفرادی طور پر بھی سرمایہ کاری کر سکتے ہیں اور دو یا دو سے زیادہ افراد پر مشتمل گروپ کی شکل میں بھی۔ اگر آپ خود براہ راست اس کاروبار میں شامل نہیں ہونا چاہتے تو کمیشن پر دوسروں کی خدمات حاصل کر سکتے ہیں۔ یہاں بھی آپ کی مرضی ہے کہ آپ صرف مردوں پر سرمایہ کاری کرنا چاہتے ہیں یا اپنی اس سرمایہ کاری میں خواتین کو بھی حصہ دار بنانا چاہتے ہیں۔ یہ بھی آپ پر منحصر ہے کہ ان مرد و خواتین سے صرف گداگری کے ذریعے لوگوں کی جیبیں خالی کروانا چاہتے ہیں یا ان کی ''تیز دھار انگلیوں'' کے ذریعے لوگوں کی جیبوں کو سرے سے غائب کرنا چاہتے ہیں۔

دنیا کی دیگر زبانوں کا تو پتہ نہیں لیکن اردو ادب میں ایک گداگر کی صدا نے ہمارے ایک کلاسیک افسانہ نگار کو ایسا چونکایا کہ ایک شاہکار افسانہ تخلیق ہو گیا۔ دلی کے چاندنی چوک میں اس گداگر نے صرف اتنا کہا ''بھائیو میرا کوئی دوست نہیں۔'' اور ہمارے افسانہ نگار صاحب اس کی خوش قسمتی پر مارے حسد کے ایسے پھڑکے کہ اپنے دوستوں کی مٹی پلید کرنے بیٹھ گئے اور پھٹکار بھرا افسانہ لکھ مارا۔ عنوان بھی کیا منحوس مارا رکھا ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ!'' ان کی دوستوں پر لعن طعن ہمارے ''دوست گریز'' بزرگوں کو ایسی بھائی کہ اس کا فیض ہر خاص و عام تک پہنچانے کے لئے اسے دسویں جماعت کے نصاب میں شامل کر دیا۔ مقصد یہ کہ وہ گداگر جھوٹا تھا جبکہ دوست ہی تمام برائیوں کی جڑ ہیں۔ وہ تو بھلا ہو کسی فقیر (گداگر نہیں) شاعر کا جس نے اس کا توڑ ایسا نکالا کہ لوگ اس کی مثالیں دیتے چلے آرہے ہیں ۔

ہم فقیروں سے دوستی کر لو
گُر سکھا دیں گے بادشاہی کا

گداگری کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اسی واقعے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

کیا زمانہ تھا کہ شہر بھر میں ایک یا دو گداگر ہوا کرتے تھے۔ وہ

دوسری صبح عمران نے گاڑی سڑک سے اُتار کر ایک گاؤں کی طرف موڑ دی۔ وہاں اُنہوں نے ناشتہ کیا، ہفتم الف حیرت سے آنکھیں پھاڑے چاروں طرف دیکھتا رہا، پھر خوش ہو کر بولا ''وہی ہے۔''

''کیا۔۔۔؟'' عمران چونک کر اُسے گھورنے لگا۔

''وہی جگہ ہے۔۔۔ صد فیصد وہی جگہ۔۔۔!''

عمران بدستور مستفرانہ نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔

''میں آپ کے یہاں کی فلمیں اکثر دیکھتا رہتا ہوں، وہ شائد یہیں فلمائی جاتی ہیں۔ مجھے اُس کنوئیں کر لے چلئے جہاں سے ہیروئن پانی بھرتی ہے اور بہت سی لڑکیاں اس کے گرد رقص کرتی ہیں۔''

عمران نے رونی صورت بنائی اور کراہ کر کہا ''بھائی وہ گاؤں تو صرف چھپن چھری اسٹوڈیو میں پایا جاتا ہے۔ یہ حاجی دودھری اللہ دتہ کا پنڈ ہے۔ حاجی کنوئیں پر ناچنے والیوں کے اباؤں کو ڈنڈے مار مار کر ہلاک کر دیں۔''

''اوہ۔۔۔!'' ہفتم الف کے لہجے میں مایوسی تھی ''آپ لوگ بہت مذہبی ہیں۔''

''بہت نہیں۔۔۔ صرف چند فیصد۔۔۔ اگر پچاس فیصد بھی ہو جائیں تو ساری دنیا میں کوئی ہم سے آنکھ نہ ملا سکے۔''

عمران سیریز از ابن صفی

شہر والوں کو اور شہر والے انہیں پہچانتے تھے۔ عام دنوں میں تو کم ہی دکھائی دیتے مگر جمعرات کو بڑے اہتمام سے نمودار ہوتے۔ ہمارے شہر میں 'سائیں کوکو ڈوڈو' بڑا مشہور گداگر تھا۔ سیاہ رنگت، دراز قد، مضبوط گٹھا ہوا جسم، بھاری مونچھیں، اور بھاری آواز کے ساتھ اس کی کیا شان گداگری تھی۔ بائیں کاندھے پر بڑا سا جھولا لٹکا رکھا ہے اور اسی ہاتھ میں بھاری بھرکم لاٹھی ہے۔ بڑے جھولے میں آٹا ڈالا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا جھولا بھی ہے۔ یہ روٹیاں اکٹھی کرنے کے لئے ہے۔ دائیں ہاتھ میں ایک ڈول ہے۔ جس نے سالن دینا ہو اس میں ڈال دے۔ دسیوں گھروں کا مختلف قسم کا سالن اسی ڈول میں جمع ہوتا رہتا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا کشکول بھی ہے۔ کسی گھر میں میٹھا پکا ہے اور وہ ''سائیں جی'' کی نذر کرنا چاہتا ہے تو اس کشکول میں ڈال دے۔ پیسہ دو

پیسہ، دونی چونی ڈالنے کے لئے کھلے کرتے کی بغلی جیبیں منہ کھلا رکھتیں۔ سائیں کوکوڈوڈو زیادہ تر شام کے وقت آتے جب لوگ کام کاج سے فارغ ہو کر گھروں میں موجود ہوتے اور خواتین نے کھانا وغیرہ پکا لیا ہوتا۔ باہر سائیں حضور زور سے اپنی بھاری بھرکم لاٹھی زمین پر مارتے اور صدا بلند کرتے "بھلا ہو"۔ ان کی آواز بغیر دستی سپیکر کے گھر کے پچھلے کونے تک پہنچ جاتی۔ اندر بیٹھی بیبیاں جیسے اسی آواز کی منتظر ہوتیں۔ آٹا، روٹی، سالن، پیسے دو پیسے، جو اس وقت آسانی سے میسر ہوتا۔ ان کی خدمت میں پیش کر دیتیں۔

سائیں جی کو عید اور دیگر تہواروں پر اوور ٹائم بھی لگانا پڑتا۔ اس دن وہ شام کا انتظار کئے بغیر صبح چکر لگاتے۔ اور شام کو اپنا معمول کا چکر تو لگانا ہی پڑتا۔ مجال ہے جو اتنے بھاری بھرکم جھولے کی وجہ سے سائیں جی کی کمر میں درد ہوا ہو یا ان کی گردن میں خم آیا ہو۔ سائیں جی کا اس بات پر پختہ ایمان تھا کہ ہر انسان نے ایک نہ ایک دن مرنا ضرور ہے۔ اور یہ بھی یقین تھا کہ موت کسی بھی وقت آ سکتی ہے۔ اسی لئے سردی ہو یا گرمی، دھند ہو یا بارش، وہ اپنے مخصوص علاقے کا چکر ضرور لگاتے۔ مبادا موت آ جائے اور ان کے نصیب کا "مال" کوئی اور اکٹھا کر کے لے جائے۔

سائیں کوکوڈوڈو بچوں کا بھی پیارا تھا۔ بچے جان بوجھ کر اس کے قریب سے گزرتے۔ وہ اپنی سخت لوہے جیسی انگلیوں سے بچوں کے سروں پر چپی کرتے ہوئے کہتا "کوکو ڈوڈو"۔ بچے سر کو سہلاتے ہوئے ہنستے ہوئے دور بھاگ جاتے۔

ہمارے شہر میں ایک اور صاحب تھے۔ لوگ انہیں "فقیر حکیم" کے نام سے جانتے تھے۔ حکیم صاحب کو جوانی میں ہی اس وقت کے سب سے بڑے نشے "افیون" نے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ جب تک کنوارے رہے اپنا نشہ اور خرچہ کسی نہ کسی طور پورا کرتے رہے۔ شادی ہوئی، نشہ اور گھریلو ضروریات میں اضافہ ہوا تو پہلے پہل وہ دوستوں اور عزیزوں سے مانگ لیتے۔ جوں جوں دوست منہ موڑتے گئے، انہوں نے راہ چلتے لوگوں کے سامنے گداگری کرنا شروع کر دی۔ پھر ذرا حوصلہ ہوا تو بازار کا رخ کرنے لگے۔ انہیں اس کاروبار میں اتنی برکت نظر آئی کہ بس باقی سب کام چھوڑ کر "صنعت گداگری" کے ہی ہو کر رہ گئے۔ وہ ہر وقت افیون کے زیر اثر جھومتے ڈولتے بازار میں داخل ہوتے اور "صرف ایک پیسہ" کا سوال کرتے۔ جب ہم نے انہیں دیکھا بلکہ پرکھا اس وقت تک حکومت نے ایک روپے سے کم ہر سکہ ختم کر دیا ہوا تھا۔ ایک دن میں نے پوچھ ہی لیا۔ حکیم صاحب اب روپوں کا

صاحبو! ذکر ہو رہا تھا کال بیل اور کھانے کی باہمی عداوت کا۔ اس کا سب سے زیادہ نقصان اس ناچیز کی جسمانی صحت کو پہنچا ہے کیونکہ مجھے یاد نہیں آتا کہ کبھی میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہو۔ نتیجہ معلوم۔ نانی جان اکثر کہا کرتی ہیں "میرے لال کے دبلا ہونے کی ذمہ دار یہ نگوڑی گھنٹی ہے' معصوم جب بھی کھانے بیٹھتا ہے یہ منحوس چنگھاڑنے لگتی ہے۔" اس اعتبار سے میں طب کی دنیا کا واحد مریض ہوں جس کی کمزوری صحت کا سبب ایک گھنٹی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ گھنٹی صرف میری صحت اور پیٹ کی دشمن نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو دن میں صرف تین بار یعنی ناشتہ' لنچ اور ڈنر کے اوقات میں میرے بے گناہ کانوں کو زحمت سماعت ہوتی۔ لیکن ادھر تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ زندگی پر نظر دوڑاتا ہوں تو گھنٹی کو اپنے دیگر معمولات میں بھی غیر معمولی طور پر مداخلت بے جا کرتے ہوئے پاتا ہوں۔ کبھی کبھار تو یوں ہوتا ہے کہ میں جونہی باتھ روم میں داخل ہوتا ہوں' کال بیل بج اٹھتی ہے۔ اس عالم میں جلدی میں صابن جسم پر ملتا ہوں' جسم پر تھوڑا بہت پانی ڈالتا ہوں اور کپڑے بدل کر "آنکھ میں پھیلتا گیا صابن" کی اذیت بخش کیفیت میں دروازے کی طرف جاتا ہوں اور جب کنڈی کھولتا ہوں تو آواز سنائی دیتی ہے: "اللہ کے نام پہ بابا"

اب آپ ہی بتائیے "خدا واسطے کا بیر" اور کسے کہتے ہیں؟"

گفتنی شگفتنی از وحید الرحمٰن خان

زمانہ ہے آپ بچپن سے ایک پیسہ ہی مانگتے چلے آرہے ہیں مہنگائی کے حساب سے اس میں اب کچھ اضافہ نہیں ہوسکتا؟۔ان کی زبان سے کیا خوبصورت جملہ ادا ہوا۔ فرمایا ''بزرگوں نے کہا تھا عبدالحکیم اگر گداہی کرنی ہے تو ایک پیسے سے زیادہ کا سوال نہ کیا کرنا، میرا سوال ایک پیسے کا ہی ہے۔اب دینے والے کوشرم تو آنی چاہئے''۔ سردی ہو یا گرمی، حکیم صاحب کے تن پر سلوٹوں سے بھرپور چُر مُری سی شلوار قمیض، اوپر پھٹا ہوا گرم کوٹ، سر پر انگریزی ہیٹ، پاؤں میں ہٹلر کے زمانے کے بوٹ ہوتے۔اگر کبھی پینٹ پہن کر نکلتے تو اس میں بیلٹ کی جگہ ازار بند کسا ہوتا۔ کسی سے کوئی چیز لے کر کھانا یا پینا سخت گناہ سمجھتے تھے۔ان کا فرمان تھا'' میں گھر سے افیم کھا کر''روزی کی تلاش'' میں نکلتا ہوں۔اس وقت میرا طائر لاہوت آسمانوں پر پرواز کررہا ہوتا ہے۔پتہ نہیں کوئی کیا کھلا دے۔اور میں آسمان سے زمین پر آ گروں''۔

حکیم صاحب نے واقعی کسی ماہر نفسیات کا جھوٹا کھا یا ہوا تھا۔میں نے گداگری میں ان سے بڑا چرب زبان اور نفسیاتی ماہر نہیں دیکھا۔چونکہ وہ شہر کے زیادہ تر لوگوں اور دکانداروں کو ان کے مذہبی رجحان کے ساتھ جانتے تھے۔اس لئے وہ لوگوں کی اس کمزوری کا خوب فائدہ اٹھاتے۔کسی اہل تشیع سے سامنا ہوتا تو دور سے'' مولاحسین۔سخی لجپال، علی علی، پنجتن پاک کی خیر'' کا نعرہ بلند کرتے۔اہل سنت بھائی کی دکان پر''غوث پاک لجپال، بیڑے کریں پار'' کی آواز لگاتے۔وہابی سے ٹاکرہ کے وقت'' صرف اللہ، اللہ مدد۔باقی سب ہیچ'' کہہ کر عاجزی سے جھک جاتے۔بعض لوگ ان کی اس''چال'' کو سمجھتے بوجھتے انکے ہاتھ پر کچھ نہ کچھ رکھ دیتے۔

وقت کے ساتھ ساتھ جہاں زمانے کی دیگر روایات بدلی ہیں۔گداگری میں بھی نئے ڈھنگ آ گئے ہیں۔ٹی وی چینل کا فیض کیبل کے ذریعے گھر گھر پہنچا تو گداگروں کی جھگیوں میں بھی انقلاب آ گیا۔انہوں نے جب دیکھا کہ بلیڈ کے اشتہار اور شیونگ کریم کی مشہوری کے لئے بھی خوبصورت عورتوں کو ایک

مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔تو انہوں نے بھی گداگری کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے خوبرو گداگرنیوں کا یونٹ تیار کیا اور اسے''میدانِ صنعتِ گداگری'' میں اتار دیا۔پہلے پہل تو لوگوں نے انہیں''گداگرنیاں'' ہی سمجھا۔لیکن رفتہ رفتہ یہ راز کھلتا گیا کہ ٹی وی اینکرنیوں کی طرح ان سے اور بہت سے کام بھی لئے جاسکتے ہیں۔

گداگر لوگوں کی نفسیات سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں، حالانکہ نہ وہ سکول کالج گئے اور نہ نفسیات کا مضمون پڑھا۔انہیں اس بات کا تجربہ ہوتا ہے کہ عورت اکیلی ہو تو کچھ نہیں ملے گا۔جس عورت کی گود میں بچہ ہو یا اس کے ساتھ بچے ہوں اس کو''تیرے بچے کی خیر'' کہہ کر رام کیا جاسکتا ہے۔مرد اکیلا ہو تو کچھ نہیں ملے گا۔اس کے ساتھ اس کی بیوی ہو تو ان سے کچھ نکلوایا جاسکتا ہے۔

جدید گداگرنیوں نے اس صنعت میں ایک نیا حیران کن طریقہ متعارف کرایا ہے۔جس میں بھیک نہ ملنے کا خدشہ بہت ہی کم ہوتا ہے۔آپ کسی دکان سے سودا خرید رہے ہیں۔یا ریڑھی والے سے پھل وغیرہ خرید رہے ہیں۔ہوسکتا ہے آپ نے بڑی مشکل سے ریڑھی والے سے دس بیس روپے کم کروائے ہوں۔جونہی آپ بٹوا نکال کر پیسے دینے لگتے ہیں آپ کے دائیں

یا بائیں طرف سے حملہ ہوتا ہے "اللہ بھلا کرے"۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک خوبرو، اگر نی آپ پر نہیں بلکہ آپ کے بٹوے پر نظریں گاڑے، ہاتھ پھیلائے، آپ کو چیلنج کر رہی ہوتی ہے "بھاگ کر دکھاؤ"۔ اس وقت آپ نہ تو بٹوہ بند کر سکتے ہیں اور نہ کہیں جائے پناہ ملتی ہے۔ وہ دس بیس جو بڑی مشکل سے دکاندار یا ریڑھی والے سے کم کروائے ہوتے ہیں۔ اس میں سے وہ اپنا حصہ وصول کر کے ٹلتی ہے۔

ہمارے شہر میں ایک "سردارنی نام کی گداگرنی" ہے۔ پندرہ سولہ برس کی تھی جب وہ گداگری کے صنعتی میدان میں داخل ہوئی۔ اب اس کی عمر پچاس کے قریب ہے۔ اس کے مانگنے کا طریقہ بڑا دلچسپ ہے۔ گھر کے دروازے پر بیٹھ کر آواز لگاتی ہے "سہیلی، اپنی نیک کمائی سے میرا حصہ"۔ سہیلی کو وہ خوب لمبا کھینچ کر ادا کرتی ہے۔ دو سال قبل محلے کی خواتین پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کے دو جوان بیٹے دوسرے شہر کی بلدیہ میں بطور سینیٹری ورکر ملازم ہیں۔ ایک دن محلے کی ایک عورت نے پوچھ ہی لیا "سردارنی، تیرے بچے اب جوان ہیں اور کماتے بھی ہیں۔ اب یہ دھندہ چھوڑ دو"۔ سردارنی جو اس میدان کے پینتیس سالہ تجربے میں ہر سوال کا جواب دینے کی ماہر ہو چکی تھی، فوراً بولی "میں نہیں چھوڑ سکتی"

"کیوں؟"۔ اس عورت نے حیرانی سے پوچھا۔ سردارنی بولی "مجھے شرم آتی ہے"۔

"کس بات کی شرم؟"۔ پوچھا گیا۔ وہ بولی "میری بہوئیں کیا کہیں گی جب ہمارے کھانے کی باری آئی تو ساس فیکٹری بند کر کے گھر بیٹھ گئی"۔

یہ ۱۹۷۵ء کے ابتدائی مہینوں کی بات ہے۔ ہمارے کالج کے دنوں میں بنگلہ دیش کو وجود میں آئے چند سال ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں بنگلہ دیش سے کافی تعداد میں بہاری پاکستان پہنچے تھے۔ ان میں سے کچھ یہاں کی صنعت گداگری سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے بھی اس میں سرمایہ لگانے کا فیصلہ کیا۔ ایسے لوگ اپنی پاکستان آمد کی داستان اس انداز سے سناتے کہ لوگوں کے ہاتھ خود بخود جیبوں کی طرف چلے جاتے۔

ایک دن ہمارے کیمسٹری کے پیریڈ میں ایک نوجوان بہاری کلاس میں داخل ہوا۔ پروفیسر صاحب نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ پان سگریٹ کا کھوکھا لگا کر روزی کمانا چاہتا ہے۔ اگر اسے ساٹھ ستر روپے مل جائیں تو کام چل سکتا ہے۔ کلاس کے لڑکوں نے اس کارِ خیر کے لئے تقریباً پچانوے روپے اکٹھے کر کے دئے۔ اس نے گھر جا کر سوچا ہوگا کہ اگر اس طریقے سے معقول رقم اکٹھی ہو سکتی ہے تو پان سگریٹ کا کھوکھا جائے بھاڑ میں۔ تقریباً تین سال بعد میں دوسرے شہر کی ایک مسجد میں نماز پڑھ کر فارغ ہوا ہی تھا کہ آواز آئی "میں غریب آدمی ہوں، ماں بیمار ہے، بچے بھوکے ہیں" وغیرہ وغیرہ۔ آواز کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ اسے غور سے دیکھا تو یہ وہی لڑکا تھا جو کالج میں آیا تھا۔ ۱۹۹۶ء میں مجھے وہی "سرمایہ کار" نظر آیا۔ شہر کے ایک معروف چوک میں ایک کونے میں کھڑا دہائی دے رہا تھا" میں کالے یرقان کا مریض ہوں، گردے فیل ہو رہے ہیں، سانس میں بھی تکلیف ہے۔ اللہ کے نام پر مدد کریں"۔ مجھے اس کے نئے ڈھنگ اور نئے کاروباری طریقے پر رشک ضرور آیا۔ چاہتا تھا کہ قریب جاؤں اور اسے ترقی کرنے پر مبارکباد دوں، لیکن کسی کا پردہ رکھنا بھی ایک نیکی ہے۔ چالیس پینتالیس سال کے عرصہ میں اللہ نے اس کے اس کام میں اتنی برکت دی ہے کہ ۲۰۱۷ء کے رمضان میں، میں نے اسے شہر کی سب سے بڑی مسجد کے باہر دیکھا۔ اس کے ساتھ دس گیارہ سال کی ایک بچی بھی تھی۔ وہ ہاتھ میں ایکسرے کا شاپر اٹھائے دہائی دے رہا تھا کہ اس کی بیٹی کے دل میں سوراخ ہے۔ جس کے علاج کے لئے مدد کی ضرورت ہے۔

محمد اشفاق ایاز کا تعلق جلالپور جٹاں (گجرات) سے ہے۔ اُردو اور پنجابی میں لکھتے ہیں۔ سنجیدہ نثر نگاری کا سفر پاکستان کے مختلف جرائد و اخبارات سے ہوتا ہوا ماہنامہ "چاند" اور "زیرِ لب" میں مزاحیہ نثر نگاری تک جا پہنچا۔ انگریزی تحریروں کو اُردو میں بھی منتقل کیا۔ افسانے بھی تخلیق کئے۔ موڈ اچھا ہو تو شاعری میں بھی لفظ جوڑ لیتے ہیں۔ ویب سائٹ vojpj.com کے ایڈیٹر ہیں۔

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

توتلے

م۔۔م ۔۔۔۔۔م۔۔۔م۔۔م۔۔م۔۔میری ب۔۔ب۔۔ب بات ہوگئی ہے ان س۔۔س۔۔ے۔۔۔حلیم کی بات پوری ہونے پہلے ہمارے حلق میں جیسے کوئی چیز اٹک گئی ہو۔جب وہ پوری طاقت سے سر جھٹک جھٹک کر ہم سے مخاطب ہوتا ہے تو گویا اس کے بجائے ہمارا ناطقہ بندھ ہوجاتا ہے کیونکہ اس کی ممیاہٹ اس سے زیادہ ہمارے اعصاب کے کھچاؤ کا باعث بنتی ہے۔کیا کریں گزارا کرنا پڑتا ہے جب وہ ایک منٹ کی بات پر بارہ منٹ صرف کر پوری کرے گا تو ہمارے اعصاب کا تناؤ نہیں بڑھے گا بھلا؟ ویسے قوت گویائی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص نعمت ہے۔جس پر جتنا بھی شکر ادا کیا جائے تو کم ہے۔

نعوذ باللہ میں کسی کی توتلاہٹ پر طنز نہیں کر رہا ہوں اور نہ کسی کا مضحکہ اڑانا مقصود ہے مگر بعض لوگ جو اس نعمت یعنی رواں گفتگو سے کم مستفید ہیں، ان کو بات کرتے ہوئی کتنی دقت اٹھانی پڑتی ہے اور بعض دفعہ تو مخاطب دَق ہوکر جھنجھلا جاتا ہے مگر اس میں اُس بچارے کا بھی کیا قصور کہ زبان کی لڑکھڑاہٹ پر قابو میں ہی نہیں رہتا۔

ایک ہمارے سفیان ہی کو دیکھ لیجیے کہ جب بھی مخاطب کرتا ہے تو ''اب ڈان، ام ڈان'' کے علاوہ کچھ نہیں کہتا۔ لاکھ کہو ''ابڈان''،''نہیں ابو جان کہو''''امڈان''،''نہیں امی جان کہو''مگر کیا کریں ابھی تین سال کا ہی تو ہے، زبان پکی بھی نہیں لیکن خیر کا شان جو اس سے ایک سال چھوٹا ہے، سے تو بہتر ہے کہ بول چال جلد سیکھ گیا ورنہ کاشان تو چھوٹی خفصہ کو ابھی تک (قطقا) کہہ کر پکارتا ہے۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ پہچان ہر چیز کی رکھتا ہے مگر دو سال ہونے کو آئے اور ابھی تک ابو جان تو کیا ''ابڈان'' تک بولنے سے قاصر ہے۔۔۔چلیں جلد یا بہ دیر، بچے ہیں ماحول کے مطابق سیکھ ہی جائیں گے مگر ہمارے ایک ہونہار کمال ترکھان ''تیل ماڈ''بقول ان کے (شیر محمد) کا کیا کریں کہ جب بھی کام پر بلاؤ تو بات چیت کچھ اس طرح ہوتی ہے۔

میں: یہ دروازہ بنانا ہے۔

شیر محمد: ھنہ۔۔اغلے۔۔ اغلے ۔۔۔ دم۔۔۔تدددو۔

یعنی بول رہا ہوتا ہے کہ ایک (شیٹ) کلو کیلیں لے کر آؤ تا کہ جھٹ پٹ کام (تمام) کردوں۔

لیجئے اور سنئے۔۔۔اب بھلا ہمارے سوا کون ہیں جو اس کی بولی سمجھ سکیں۔ وہ تو اللہ نے مہربانی کی کہ شیر محمد کو ایک مترجم بیٹا دے دیا اور جب وہ ساتھ ہوتا ہے تو ہمیں لمبے لمبے اشارے اور بار بار سمجھانے کی ضرورت نہیں رہتی، شیر محمد بیٹے کو کچھ ایسے

اشارے کرتا ہے کہ وہ سمجھ کر ہمیں بے تکان ٹرانسفر کرتا ہے۔ ہم اس کے ذریعے اس کا مطمعِ نظر جان کر ہدایات پر عمل کر کے مطلوبہ لوازمات مہیا کر دیتے ہیں۔ ویسے بلا کا قابل اور ماہر ہے جو کاریگر ایک دروازہ دن میں بناتا ہے یہ اسے تین چار گھنٹوں میں نمٹا دیتا ہے۔

بعض گونگے بھی ناگیدڑوں کی طرح ''غوں غاں'' مچا کر یکدم سامنے آکر دستِ عسرت دراز کر دیتے ہیں۔ اب پتہ نہیں بندہ واقعی گونگا ہے یا اداکاری کر رہا ہے۔

غالباً سن ترانوے کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے جب میرا بڑا بھائی شہر کے وسط میں واقع ایک مصروف پٹرول پمپ پر کیشیئر تھا۔ جب وہ بیمار ہوتا تو مجھے بطور(سٹفنی) اضافی پہیے کے استعمال کرتا تھا۔ میں بھی میٹرک امتحان کے بعد کھیتوں میں کولہوں کے بیل بنے نہ چاہتے ہوئے بھی بابا کے غصے کی ڈر سے چارو ناچار کبھی گوڈی کبھی گائے کا چارا لاتے تھے۔ خیر غنیمت تھا کہ اسی بہانے شہر کی رنگینیاں تو دیکھ لیتے۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ جب میں ایک موٹر کار میں پٹرول ڈلوار ہا تھا تو اچانک ایک توتلا ہاتھ سامنے کر کے منہ کو کچھ ایسا ٹیڑھ سا دے کر مانگنے لگا کہ جھٹ سے ایک روپیہ کیش سے نکال کر دے دیا۔ اس زمانے میں روپیہ میں بھی کافی طاقت ہوتی تھی یعنی آج کے دس روپے کے برابر ہوتا تھا۔ تھوڑا آگے جا کر وہ ایکٹر فر فر بولنے لگا، جس پر میرے ساتھی مومن خان نے کہا کہ اسے کچھ مت دینا، پکا اداکار ہے. تب سے محتاط رہتا تھا۔ ایک ہمارے ہمسایہ (لیپا۔۔۔قی) یعنی صاحبزادہ ہے جس کو بڑے بھائی دن بھر کھیتوں میں جوتے تھے اور ہر دفعہ جب مجھ سے ملتا تو دونوں ہاتھوں سے پالکی بنا کر منہ پر'' ڈمغ ڈومغ'' یعنی طبلے کی آواز نکالتا تھا جس کا مطلب یہ ہوتا کہ بھائی تمام دن کام کروا کروا کر تھکا دیتے ہیں اور میری شادی کی کوئی فکر نہیں ان لوگوں کے ساتھ۔۔۔ پھر بالآخر اس کی شادی ہو ہی گئی۔ اب ماشاءاللہ اس نحیف ونزار توتلے کے دو لحیم شحیم بیٹے اور فربہ مائل پہلوان نما بیٹی بھی ہے لیکن بھائیوں نے ستم یہ کیا کہ ایک بیٹھک نما گھر اور چند بیگے زمین دے کر جدا کر دیا۔ پہلے پہل تو بچارا گداگری کرتا تھا اور اپنی گونگیاہٹ سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا، مگر اب بچے بڑے ہو گئے ہیں. ایک موٹر سائیکل مکینک بن گیا تو دن کچھ پھر گئے ہیں۔

قوتِ گویائی سے محروم لوگ یا وہ جو اٹک اٹک کر بولتے ہیں جس کے ساتھ وجود بھی لہکتا رہتا ہو، بیشک اس معاشرے کے کارآمد شہری بن سکتے ہیں، جس طرح اوپر مذکورہ۔۔۔ تیل مامد یعنی شیر محمد یا حلیم صاحب ہیں لیکن لیپا. یعنی قی صاحبزادہ۔۔اُس بہروپیئے کی طرح کچھ ناکارہ پرزے بھی مل جاتے ہیں جو یا تو غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر دستِ سوال دراز کرتے ہیں یا پیشہ بنا لیتے ہیں۔ ہمارے ایک بہت محترم بڑے بھائیوں کی طرح جناب جلال الدین جس کو ہم اپنی بولی میں (روری) بڑے بھائی کہتے ہیں، گونگے بہروں یعنی سپیشل پیپل کے استاد ہیں۔ ان سے اکثر جب بات ہوتی ہے تو پوچھ لیتے ہیں کہ بڑے بھائی آپ ان لوگوں کو کیسے (ہینڈل) قابو کرتے ہیں۔

وہ اپنی سدا بہار مسکراہٹ سے بکھیرتے ہوئے کہتے ہیں ''دیکھو گوہر تم جس طرح بچوں کے خالی ذہن کو الف با تا سے شروع کر کے بالآخر بڑی بڑی کتابوں کو پڑھانے کے اہل بنا لیتے ہو اسی طرح ہمارا بھی ایک مخصوص طریقہ تدریس ہے، جس کے ذریعے ہم ان سپیشل بچوں کو سپیشل تعلیم دے کر ملک کا کارآمد شہری بنا لیتے ہیں۔''

حکومت پاکستان اور بعض غیر ملکی فلاحی ادارے اس سلسلے میں بہت اہم کردار کر رہے ہیں جو ایسے لوگوں کے اعتماد کو بلند کرنے کیلیے اور ان کو احساس محرومی سے دور رکھنے کے لیے ایسے مستحسن اقدامات کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو توفیق دیں کہ بجائے ایسے لوگوں کا تمسخر اڑانے کے اس کو احساس کمتری میں مبتلا نہ ہونے دیں۔۔ آمین۔

گوہر رحمٰن گہر مردانوی کا تعلق ضلع مردان کی تحصیل تخت بھائی (لوندخوڑ) سے ہے۔ سرکاری ملازم ہیں۔ شاعری اور مضمون نگاری اِن کا میدان ہے۔ مضامین میں لطافت اور طنز کا چھڑکاؤ ففتی ففتی ہوتا ہے۔''ارمغانِ ابتسام'' کے مستقل کرم فرما ہیں۔

حنیف عابد

حفظِ ماتقدم

انسان کی زندگی میں اکثر ایسے مراحل آتے ہیں جب وہ کسی بھی ممکنہ خطرے یا نقصان سے محفوظ رہنے کے لئے حفظِ ماتقدم کے طور پر کچھ کرگزرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بچپن میں اکثر کھانے کی چیزیں مخصوص مقدار سے زائد نہیں ملتی تھیں، اماں کا خیال ہوتا کہ زیادہ کھانے سے دانت معدہ وغیرہ وغیرہ خراب ہو سکتے ہیں۔ اس زمانے میں پہلی مرتبہ کچھ کرگزرنے کا خیال ذہن میں کوندا اور ہم اس امرِ محال کی انجام دہی کے لئے تیار ہو گئے۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر پہلے تو ہم نے کوشش یہ کی چیز کہ جب تقسیم ہونے لگے تو سب سے پہلے لینے کی کوشش کی جائے۔ یہ مرحلہ جب بخیر وخوبی انجام تک پہنچ گیا تو سب سے آخیر میں ایک مرتبہ پھر امیدوار کے طور پر خود کو پیش کیا جائے۔ خوش قسمتی سے پہلی مرتبہ یہ فارمولا کام کر گیا اور ہماری خوشی کے مارے باچھیں کھل اٹھیں کہ دیکھا آخر ہم نے کمال مہارت سے امی جان کو غچہ دیتے ہوئے دوسری بار چیز حاصل کر لی تھی۔ اس دن تو یوں سمجھیں کہ ہمارے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ کچھ دن بعد پھر ایسی ہی صورتحال درپیش ہوئی تو ہم نے وہی آزمودہ فارمولا استعمال کیا اور سب سے پہلے چیز لے کر فوراً چٹ کر گئے اور ایک مرتبہ پھر امیدوار بن کر جب امی کے سامنے آئے تو اس مرتبہ دوبارہ گوہر مراد کے حصول کے بجائے امی کی جانب سے انتہائی سرد مہری کے ساتھ ہاتھ پکڑ کر ہمیں سائیڈ میں کر دیا گیا۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ امی نے شائد ہمیں ایک طرف ہونے کو کہا ہے تاکہ وہ ہمیں اپنے دستِ مبارک سے وافر مقدار میں چیز عطا کر سکیں یہ لیکن یہ محض خام خیالی ہی ثابت ہوا۔ جب ہم نے دیکھا کہ والدہ ماجدہ مائل بہ کرم نہیں ہیں تو ہمت جتاتے ہوئے ہم بول پڑے ”امی مجھے بھی دیں ناں!“

امی ہماری اس جسارت پر حیران ہو گئیں، اُنہوں نے کہا ”بیٹا آپ کو مل چکی ہے، دوبارہ لینا یا جھوٹ بولنا مناسب نہیں ہے۔“

وقت کے ساتھ چیزیں تبدیل ہوتی گئیں، زندگی میں بہت کچھ حاصل کرنے کی تگ و دو میں اصول ضوابط نظر انداز ہوتے گئے۔ ایک چیز جو ساتھ رہی وہ حفظ ماتقدم کی عادت تھی۔ چھٹی حس ممکنہ خطرے سے آگاہ کرتی اور حفظِ ماتقدم کی عادت پیش بندی پر مجبور کر دیتی۔ دفتری امور میں ان دونوں خصوصیات کی بنا پر ہم ہمیشہ بری گھڑی کا شکار ہونے سے بچ گئے۔ بعض مواقع پر تو اس خوبی کی وجہ سے تعریف و توصیف سے بھی نوازے گئے۔ اپنی اسی خوبی کی وجہ سے ترقی کی منازل بھی جلد طے کیں اور سینئر پوزیشن پر آ گئے۔ معاشی حالات جوں جوں مضبوط ہوتے گئے والدہ ماجدہ

کی جانب سے شادی کرنے کے لئے دباؤ بڑھنے لگا۔ ہم جو ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں بالخصوص حفظِ ماتقدم کے فارمولے کی بنا پر خود کو تقریباً عقلِ کل سمجھنے لگے تھے ہر معاملے میں بڑھ چڑھ کر ڈینگیں مارنے کی عادتِ بد کا بھی شکار ہو چکے تھے۔ ہماری شادی کے لئے جب لڑکی کی تلاش شروع ہوئی تو ہم نے مین میخ نکالنی شروع کی کہیں لڑکی میں کوئی نقص نکال دیتے کہیں لڑکی کے گھر والوں میں۔ بڑی تگ و دو کے بعد ایک لڑکی کا انتخاب عمل میں آ گیا جو ہمیں بھی پسند تھیں۔ اللہ اللہ کر کے شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں تو کئی مرحلے ایسے آئے جہاں ہماری چھٹی حس کی بتائی ہوئی چیزیں غلط ثابت ہوئیں اور حفظِ ماتقدم کے لئے کئے جانے والے اقدامات کے نتائج منفی برآمد ہوئے۔ وقتی طور پر ہمیں جھٹکا تو لگا کہ یہ کیا؟؟ لیکن شادی کی تیاریوں کی مصروفیت میں ہم نے ان امور پر زیادہ توجہ نہیں دی اور دیگر کاموں میں مصروف ہو گئے۔ اللہ اللہ کر کے وہ گھڑی آ گئی جب ہماری بیگم عروسی جوڑے میں لدی پھندی ہمارے گھر پہنچ گئیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ لڑکیاں دلہن بننے کے خواب دیکھتی ہیں اور اس دن کے لئے بہت زیادہ متجسس ہوتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ لڑکے بھی اس دن کے لئے بہت کچھ خواب اپنے ذہنوں میں بسائے ہوتے ہیں۔ رومانی ناول پڑھنے اور رومانی فلمیں دیکھنے کی وجہ سے میں نے کچھ زیادہ ہی خواب دیکھ رکھے تھے۔ اللہ اللہ کر کے جب میں رات کو حجلۂ عروسی میں دھڑکتے دل کے ساتھ داخل ہوا تو زبان گنگ سی ہو گئی۔ بیڈ پر گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہوئی شریک سفر سے گفتگو کا آغاز کہاں سے کیا جائے؟ کس جملے سے بات شروع کی جائے؟ ذہن پر جیسے جمود سا طاری ہو گیا ہو کوئی بات جب نہیں سوجھی تو جھٹ سے سلام کر لیا، سلام کا جواب سر کی جنبش سے ملا۔ پھر یاد آیا کہ ابھی منہ دکھائی ہونی ہے! سوچا وہ تو ہو چکی ہے لیکن پھر خیال آیا کہ منہ دکھائی کے لئے سونے کا جو سیٹ بنوایا تھا اس کا کیا ہوگا؟ یہ خیال آتے ہیں جھٹ سے الماری میں سے سونے کا سیٹ نکالا اور بستر پر بیٹھتے ہی بیگم کے کچھ بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ جب تین چار منٹ گزرنے کے بعد بھی اس جانب سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تو دھڑکتے دل کے ساتھ بیگم کا گھونگھٹ پلٹ دیا۔ سامنے بیگم آنکھیں پھاڑے سوالیہ نظروں سے گھور رہی تھیں۔ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سونے کے سیٹ کا ڈبہ ان کی جانب بڑھایا تو انہوں نے لپک کر ڈبہ پکڑ لیا اور یک دم بولیں "کیا آپ کا سیٹ دینے کا ارادہ بدل رہا تھا جو آپ اتنی دیر سے سوچوں میں ڈوبے ہوئے تھے؟"

یہ سنتے ہی میرے حلق میں جیسے کسی نے مینتھول کی شیشی الٹ دی ہو۔ میں ہکا بکا بیٹھا ہوا تھا جلدی سے بولا "نہیں نہیں ایسی بات نہیں ہے وہ میں، وہ! بات دراصل یہ ہے! وہ میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ!"

ابھی میری زبان لڑکھڑا ہی رہی تھی کہ بیگم نے سیٹ دیکھتے ہوئے کہا "سیٹ برا نہیں ہے لیکن اس کی بناوٹ پرانے انداز کی ہے، بہر حال شکریہ! اچھا آپ ایسا کریں کہ جلد کولڈ ڈرنک کا بندوبست کر لیں میرا بڑا دل کر رہا ہے یخ کولڈ ڈرنک پینے کا۔ جب تک میں چینج کر لوں یہ بھاری بھر کم جوڑا پہننا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔ اف میرے خدا!!"

بیگم یہ کہہ کر باتھ روم کی جانب چل دیں اور میں کمرے سے باہر جانے لگا تا کہ "یخ کولڈ ڈرنک" کا بندوبست کر سکوں۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے گھر میں میری چھٹی حس ہمیشہ ناکام ثابت ہوئی ہے۔ حفظِ ماتقدم کے لئے کئے جانے والے تمام اقدامات کے نتائج ہمیشہ اُلٹے ثابت ہوتے ہیں۔

حنیف عابد شاعر، ادیب، نقاد، کالم نگار، مضمون نگار، فکشن نگار، ناول نگار، بچوں کے ادیب اور سینئر صحافی ہیں۔ آپ کا تعلق کراچی سے ہے۔ ۳۰ سال سے زائد عرصے سے صحافت سے وابستہ ہیں۔ موصوف اپنی غیر جانبدار اور دوٹوک رائے رکھنے کے حوالے سے بدنام ہیں۔ بہترین تجزیہ کار ہیں، ان کی رائے کو رد کرنا عموی طور پر ممکن نہیں ہوتا۔ ملکی اور عالمی سیاست پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ پرنٹ کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا میں بھی کام کرنے کا تجربہ رکھتے ہیں۔ موصوف کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں ایک شاعری کا مجموعہ بھی شامل ہے۔ مزید کئی کتابیں زیر ترتیب ہیں جو جلد ہی منظر عام پر آنے والی ہیں۔ ایک سال سے زائد عرصے سے ارمغانِ ابتسام میں تسلسل کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔

محمد ایوب صابر

منشور یا من کا شور

انتخابی میلہ اپنے عروج پر ہے۔ ہر سیاسی جماعت اپنے ووٹر کا دل لبھانے کے لئے دلربا انداز میں اپنے اپنے منشور شائع کر رہی ہے۔ اِس کو غور سے پڑھیں تو ایسا لگتا ہے کہ یہ منشور سے زیادہ مَن کا شور ہے۔ ہر دفعہ انتخابی معرکے سے پہلے ایسے ہی منشور پیش کئے جاتے ہیں لیکن وہ سب منشور عوام کی چیخ و پکار کے شور میں دب جاتے ہیں۔ سیاسی بازی گر اگلے انتخابات میں جادوگری سے پھر عوام کا دل جیت لیتے ہیں۔ اِن کھلاڑیوں میں اکثر شکاری بھی ہوتے ہیں جو جانتے ہیں کہ کس طرح کانٹے کے ساتھ تھوڑا سا ٹکڑا لگا کر مچھلی کا شکار کیا جاتا ہے۔ مچھلی تو اپنی بھوک مٹانے کے لئے اُس ٹکڑے پر جھپٹتی ہے لیکن اُسے شاطر شکاری کی چال کا اندازہ نہیں ہوتا جس نے کانٹے کو ٹکڑے میں چھپایا ہوتا ہے۔ اِس کا مطلب ہے کہ منشور بھی ایک کانٹا ہے۔

میں نے اپنے دوست خواجہ خوامخواہ سے پوچھا کہ منشور کیا ہوتا ہے؟ اُس نے کہا کہ منشور دراصل وہ وعدے ہوتے ہیں جن کو چارہ بنا کر بھولے بھالے عوام کا شکار کیا جاتا ہے۔ اس نے سمجھایا کہ سیاستدان اپنی تقریروں میں وعدے کرتے ہیں اور انتخابات جیتنے کے بعد اِن وعدوں کو بھولنے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں۔ اُس وقت اُن کے من کا شور اندر سے سنائی دینے لگتا ہے۔ اِس شور کے دبانے کے لئے سیاستدان اِسے کسی دستاویز کی شکل دیتے ہیں تا کہ مَن کا شور ذرا تھم جائے۔ رہنما کے مَن کا شور تو منشور کے پیٹ میں چلا گیا لیکن بھوکے پیٹ رات کو سونے والوں کے من کا شور کیسے ختم ہوگا۔

جس قدر دلکش منشور پیش ہو رہے ہیں اُسی قدر عوام کے مسائل میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مہنگائی کا خاتمہ ہر ایک پارٹی کا منشور ہے لیکن مہنگائی کا درخت بانس کی طرح ایک دن میں 12 انچ بڑا ہو جاتا ہے۔ اب تو کچھ لوگ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہر سیاسی جماعت اپنے منشور سے مہنگائی کا ذکر نکال دے، شاید اِس طرح مہنگائی کا جن بوتل میں بند ہو سکے۔ ایک سیاسی جماعت نے اپنے منشور میں مزدور کی تنخواہ ایک تولہ سونے کے برابر کرنے کی گپ ماری ہے۔ اُس پارٹی کو یقین ہے کہ اُس کی حکومت کبھی نہیں آ سکتی۔ اِس لئے نہ ہوگا نو من تیل اور نہ رادھا ناچے گی اور اگر نو من تیل ہو گیا یعنی اُن کی حکومت آ گئی تو سب سے پہلے تولے کو ماشے کے برابر قرار دیا جائے گا۔ اُس پارٹی کے سربراہ ۱۹۷۳ء کے آئین کے تناظر میں خود بھی ''پل میں تولہ، پل میں ماشہ'' کے مصداق تبدیل ہوتے ہیں۔ وزارتِ عظمیٰ کی کرسی کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اُن کے بالوں میں چاندی اتر آئی ہے لیکن اُن کی چاندی کب ہوگی؟

نوجوانوں کے ایک رہنما نے اپنے منشور میں امریکی غلامی سے آزادی کا خواب لکھ دیا ہے اور اِس خواب کو لکھنے سے پہلے انہوں نے انٹیلی جنس سربراہ کے ہمراہ امریکی سفیر سے ملاقات کر کے اِس خواب کا ذکر کرنے کی اجازت طلب کی تھی۔ تمام جماعتوں نے اپنے منشور میں بے روزگاری کے خاتمے کا دعویٰ کیا ہے۔ میں اُن سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ کرۂ ارض پر کوئی ملک ایسا ہے جس نے بالکل بے روزگاری نہ ہو؟ بیروزگاری

کے خاتمے کی بات بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی دعویٰ کرے کہ وہ سیڑھی لگا کر چاند پر جا سکتا ہے۔ اِسے دیوانے کا خواب ہی کہہ سکتے ہیں۔ جو قوم آج تک چاند کی رویت کے بارے میں اتفاق نہیں کر سکی وہ خلائی شٹل کے ذریعے بھی چاند پر نہیں پہنچ سکتی۔ اب یہ نہ کہہ دینا کہ میٹرو بس کا روٹ تبدیل کر کے چاند پر جا سکتے ہیں۔

میں نے ایک دن خواجہ خوامخواہ سے پوچھا کہ آخر لوگ چاند پر کیوں جاتے ہیں؟ اُس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا کہ جب چاند کو دیکھو تو کیا نظر آتا ہے؟ میں نے کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ چاند پر کوئی بڑھیا بیٹھی چرخہ کات رہی ہے۔ خواجہ خوامخواہ نے کہ خود سوچو کہ اب تک اُس بڑھیا نے کتنی روئی کات لی ہوگی؟ اس کا مطلب کہ چاند پر جانے کا سب سے بڑا مقصد بڑھیا سے سوت لانا ہے۔ میں نے خواجہ خوامخوہ سے پوچھا کہ چاند اور سیاسی جماعتوں کے منشور میں کوئی تعلق ہے؟ اُس نے کہا کہ جب تک ہماری قوم چاند پر نہیں پہنچ جاتی اُس وقت تک منشور پر عمل درآمد بھی ناممکن ہے۔

ایک سیاسی جماعت نے اپنے منشور میں لکھا ہے کہ اگر ہماری حکومت آگئی تو بی اے تک تعلیم مفت ہوگی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہمارے ہاں پہلے ہی نوجوان بی اے کی ڈگریاں ہاتھ میں لئے مالی اور چپڑاسی کی نوکریاں تلاش کر رہے ہیں۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم مفت ہے، اِس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ پچھلے دنوں ایک نوجوان نے احتجاجاً گریجویشن ڈگری کی فوٹو کاپیاں کروا کے اِس میں پکوڑے بیچنے شروع کر دیئے۔ اِس پر ایک وزیر سے سوال کیا گیا کہ اب تو پکوڑے بی اے کی ڈگریوں میں بک رہے ہیں۔ اِس پر وزیر موصوف نے جواب دیا کہ یہ ہمارے دور میں ترقی کی نشانی ہے۔ یہاں لوگ پکوڑے بھی بی اے کی ڈگری میں رکھ کر کھاتے ہیں۔ آخر کب تک اخبار پر پکوڑے رکھ کر کھاتے رہیں گے؟ اخبار دیکھ کر آدمی پکوڑے کھانا ہی بھول جاتا ہے۔ اِس قدر پریشان کُن خبریں ہوتی ہیں کہ پکوڑے کھانے والا جل بھن کر خود پکوڑا بن جاتا ہے۔ اِس دفعہ انتخابات میں تانگہ پارٹیاں بھی اپنا منشور پیش کر رہی ہیں۔ بعض پارٹیوں کے وجود کا احساس ہی منشور سننے کے بعد ہوتا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ تمام پارٹیوں کے منشور جمع کر کے اِس کا گرینڈ منشور تیار کروں۔ جب منشور پک جائے تو اپنی سیاسی جماعت ''منشور پارٹی'' کے نام سے رجسٹر کروا دوں۔ مجھے اِس بات کی فکر نہیں کہ منشور پر عملدرآمد ہوگا یا نہیں؟

آج تک کس پارٹی نے اپنے منشور پر عمل کیا ہے۔ گزشتہ انتخابات کے دوران ایک امیدوار نے اپنا منشور کرسی کا حصول قرار دیا۔ اُس نے نہایت ایمانداری سے کام لیتے ہوئے اپنے بینر پر لکھ دیا کہ ''اقتدار کے بھوکوں میں ایک اور اضافہ'' اُس نے اشتہار میں لکھا کہ میرا مقصد صرف اقتدار میں آ کر عوام کو لُوٹنا اور اپنی جیبیں بھرنا ہے۔ اگر کوئی مجھ سے ملک و قوم کی بے لوث خدمت کی امید رکھتا ہے تو مجھے ووٹ مت دے۔ میرا نصب العین وہی ہے جو باقی تمام سیاسی جماعتوں کا ہے۔ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اپنے ووٹر کو قبل از وقت بتا دیا ہے کہ میرا اصل مقصد کیا ہے۔ خواجہ خوامخوہ کا خیال ہے کہ پاکستان میں منشور پر پابندی لگائی جائے کیونکہ منشور ہی وہ ہرا ہرا چارہ ہے جس سے ووٹر جیسے منہ زور گھوڑے کو پکڑ کر بیلٹ بکس کے اصطبل میں بند کیا جاتا ہے۔ اِس دفعہ انتخابات میں سیاسی جماعتیں اپنے اپنے منشور سے زیادہ مخالفین کی خامیوں کا واویلا مچا رہی ہیں گویا منشور تبدیل ہو گیا ہے۔ ایک بے ہنگم شور سنائی دے رہا ہے ایسے حالات میں یہی سوال اٹھتا ہے کہ یہ منشور ہے یا مَن کا شور ہے؟

محمد ایوب صابر کا تعلق سیالکوٹ سے ہے جبکہ ۲۷ سال سے دہران (سعودی عرب) میں مقیم ہیں، ہوٹل منجمنٹ پیشہ ہے۔ ظرافت نگار، شاعر، کالم نگار، افسانہ نگار، ناول نگار، تحقیقی مضمون نگار سبھی کچھ ہیں۔ غزلوں اور افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور کئی زیرِ اشاعت ہیں۔ دو فکاہیہ مضامین کے مجموعے ''دریچۂ ظرافت'' اور ''نسخہ ہائے لطافت'' بھی شائع ہو چکے ہیں۔ مزید ایک مجموعہ ''چشمۂ فکاہت'' زیرِ اشاعت ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کو اُن کے مسلسل قلمی تعاون کا افتخار حاصل ہے۔

نسلِ نو کا NO جوان

مراد علی شاہد

عصر الاقدام میں جب بچہ جوان ہوتا تو گھر کے بڑے بوڑھے اس کی حرکات وسکنات سے اندازہ لگا لیتے کہ اب لونڈے نے "ٹیڑھی چیز" نکالنا شروع کر دی ہے، آثار جوانی کی آمد آمد ہے لہٰذا پاؤں میں شادی کی بیڑیاں پہنا کر تاعمر قیدِ زوج میں باندھ دیا جائے۔ بچہ پہلے گھبراتا، پھر تصورات عروس الخلوط میں شرماتا اور شادی کا باقاعدہ اعلان کر دیتا۔ جب تک یہ سنِ عقل کو پہنچتا (اگرچہ بیوی ساری عمر عقل نہیں آنے دیتی) تو سات بچوں کا باپ بن کر اماں کے پاؤں داب رہا ہوتا (اپنی نہیں اپنے بچوں کی اماں کے)۔ کچھ بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو گھر کے بزرگ خبردار نہیں کرتے بلکہ بچے "خبردارانہ حرکات" سے باور کروا رہے ہوتے ہیں کہ اب "شیدا" جوان ہو گیا ہے اور اب اگر شادی نہ کی تو۔۔۔!

ایسے بچوں کو والدین خبردار نہیں کرتے ڈائیریکٹ اعلانِ شادی کر دیا جاتا ہے۔ ایسے بچے "حرکات اور الاہبے" سے پہچان لئے جاتے ہیں کہ اب بچہ جوان ہونے کے ساتھ ساتھ اوباش بھی ہوتا جا رہا ہے۔ لہٰذا اب اسے بیوی کے "پلو" سے باندھ دیا جانا چاہئے۔ شادی کے "کلے" اور بیوی کے "پلو" سے باندھ دیا جائے تو خود ہی نانی یاد آ جائیگی۔ اور ایسا ہی ہوتا ہے کہ یہی جوان بعد از شادی محلہ کی ہر اُس لڑکی کو جسے کسی دور میں "تاڑتا" فرضِ جوانی خیال کرتا تھا اب بہن، باجی کہہ کر اسے بھی پکار رہا ہوتا ہے جو کبھی از خود "چھڑنے" کو تیار بیٹھی ہوتی تھی۔

سے بدلتے دیر کتنی لگتی ہے۔ بدلتے وقت کے ساتھ حرکات و انداز بھی بدل جاتے ہیں۔ بلکہ کچھ کچھ نوجوانوں کی عادات "مخنثہ ومونثہ" سے لگتا ہے کہ یہ نوجوان نہیں بلکہ NO جوان ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ کہ ان میں کوئی خوبی نہیں ہوتی۔ china made مال کی طرح نرم و نازک کہ بس ذرا زور سے چھوا تو "برگِ چھوئی موئی" کی طرح رُوٹھ اور ٹوٹ جائے گا۔ عرصہ دو دہائیوں سے میرا ایک تعلیمی ادارے میں بچوں سے مسلسل رابطہ و واسطہ رہتا ہے تو اپنے تجربے کی بنیاد پر آج کے no جوانوں کی عاداتِ "مخنثہ ومونثہ" مختلط دیکھ کر یوں گماں ہوتا ہے کہ میرے یہ نوجوان عمرِ شباب میں ہی "نوعروسانِ چمن" یا مخلوط النسل قسم کی کوئی مخلوط دکھتے ہیں۔ عاداتِ مخنثہ کے حامل ایسے نوجوانوں کو میں نے اجزائے خمسہ میں تقسیم کیا ہے۔

برگرو پیزا نوجوان

عرفِ عام میں "ممی ڈیڈی" اور اوصافِ خاص میں زنانہ حرکات وسکنات کے حامل ایسے بچوں کو کھانے میں پیزا، برگر، سینڈوچ، کولڈ ڈرنکس، پسند ہوتی

ہیں۔ ایسے بچے پیزا کھاتے نہیں بلکہ ترسا ترسا کر کھاتے ہیں۔ اور پیزا محض فیس بک پہ اسٹیٹس اپلوڈ کرنے کے لئے کھاتے ہیں۔ انداز گفتگو ''لچکانہ'' اور صفات ''زنانہ'' کا متحمل ہونا وجہ شہرت خیال کرتے ہیں۔ ایسے نوجوانوں کو پاپا اتنا پسند نہیں ہوتا جتنا ''پاپا جونز''۔ سلام کی بجائے ''ہیلو ہائے'' پہ ہی اکتفا کرنا پسند کرتے ہیں بلکہ کبھی کبھار تو اِن کی ''ہائی'' خود بخود ہی نکل جاتی ہے۔ کولڈ ڈرنکس اور منرل واٹر کی 250ml کی بوتل کم و بیش 50 گھونٹ میں اِسے اِتنا ترسا کے پیتے ہیں کہ نہ صرف بوتل کا دم نکلنا شروع ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات بوتل ہاتھ جوڑ لیتی ہے کہ اے شبابِ عہدِ نو، اب تو میرے اوپر پرنٹڈ میٹریل بھی آپ کے نرم و نازک ہاتھوں کی نرماہٹ سے مٹنا شروع ہو گیا ہے۔ اب تو میری جان چھوڑ دے۔ ایسے نوجوان اپنا تعارف پاپا کی نسبت سے نہیں ممی کے شجرہ سے کرواتے ہیں۔ اپنی کلاس کے (بطور ٹیچر ایک ادارے میں کام کرتا ہوں) ایک ایسے ممی ڈیڈی بچے سے پوچھا کہ ''آپ کے پاپا کیا کرتے ہیں'' تو شرماتے، لجاتے، لچکاتے ہوئے گویا ہوا کہ ''سر پاپا وہی کرتے ہیں جو مما کرواتی ہیں''۔۔۔۔۔ اور پاپا؟۔۔۔ ''جی پاپا وہی کرتے ہیں جو مما چاہتی ہیں۔''۔۔۔ اور مما کیا چاہتی ہیں۔۔۔۔ وہ کیا چاہیں گی سر ''مما تو خود پاپا کی چاہت ہیں۔'' ایسے بچوں کو yuppy بچے بھی کہتے ہیں یعنی جو بات سمجھ نہ آئے اس پہ yup, yup اور سمجھ آ جائے تو waooo۔ انہیں she بچے بھی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ ہر بات پہ "she, she" یا ''سی، سی'' کہہ رہے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار تو یہ ''سی'' کہتے ہی نہیں بلکہ نکل بھی جاتی ہے۔ ایسے بچوں کا کوئی اور فائدہ ہو نہ ہو خرچہ بہت کم کرواتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ایک بہن کے ساتھ ایک ''ممی ڈیڈی بچہ'' مفت میں پرورش پا جاتا ہے کہ ماسوا ''انڈر گارمنٹس'' کے ہر شے باجی کی استعمال شدہ اپنے استعمال میں لے آتے ہیں۔ اور تو اور باجی کے جھمکے تک پہن کر جھمک جھمک اور ٹھمک ٹھمک کے سے اندازِ خرامانہ طاؤس چلتے ہیں کہ مسٹر فراز کم مس فرزانہ کا گماں زیادہ ہوتا ہے۔

F B جنریشن

فیس بک جنریشن کے نوجوان face ہی سے پہچان لئے جاتے ہیں۔ کہ ایسے بچے محض faces بناتے ہیں، book سے ان کا دور دور تک کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ ایسے نوجوان face کے نزدیک اور book سے بہت دور رہتے ہیں۔ FB پہ mail اتنی چیک نہیں کرتے جتنی female اور وہ بھی فی میل (per mile) کی سپیڈ سے۔ ان کی نظروں سے کوئی بھی female بچ

نہیں سکتی۔ کسی دن اگر سٹیٹس تبدیل کرنا بھول جائیں تو وہ دن ان کے لئے انتہائی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جلد کسی کے ہاں مہمان نہیں بنتے، البتہ انہیں کے ہاں مہمان بننا پسند ہے جن کے ہاں Wifi سگنل پورے آتے ہوں۔ ایسے نوجوان جن کے ہاں بھی مہمان بن کر جاتے ہیں حال واحوال سے قبل پوچھتے ہیں کہ آپ کے وائی فائی کا pass word کیا ہے۔

پرانے لوگ کہا کرتے تھے کہ نیکی کر دریا میں ڈال، FB جنریشن کہتی ہے کہ کچھ بھی کر face book پہ ڈال۔ ان کی گفتگو و اندازِ گفتگو دونوں ہی ''قابلِ دید'' ہوتا ہے۔ کبھی کبھار تو

دوران گفتگو " کتھک ، سالسا، کلاسیکل، ڈسکو، لاوا، اور جھومر وہ
کون سا ڈانس ہے جن کے step یہ نہ کر پاتے ہوں۔ گویا گفتگو
کم اور ڈانس زیادہ۔ FB جنریشن کی گفتگو کا آغاز
like, dislike, status, upload, سے شروع ہو کر
feeling sad پہ جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ ان کی آپس میں
ناراضگی بھی عجب قسم کی ہوتی ہے کہ کیا لڑکیاں آپس میں ''طعنے
معنے'' دیتی ہوں گی۔ مثلاً تم نے باجی کے سٹیٹس کو like کیوں نہیں
کیا، میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ اور دوست بھی ماشاللہ،
status سے قبل ہی باجی کو like کیے بیٹھا ہوتا ہے۔ یا
پھر۔۔۔۔ میری مما پاپا کی شادی کی تصویر دیکھی تھی نا، کتنے cute
لگ رہے تھے نا، مگر میں آپ سے بات نہیں کرتا تم نے اس پہ اتنا
گندہ کمنٹ کیا کہ اس پہ مما ، پاپا کو ڈانٹ پلا رہی تھی کہ دیکھو اپنے
لاڈلے کے دوست، حالانکہ مما نے کمنٹ پہ دل والا لائیک کیا ہوا
تھا۔۔۔۔۔ فیس بک سٹیٹس نے لوگوں کو استعمال کر کر کے اتنا
گرا دیا ہے کہ بیوروکریٹس قسم کے لوگ سٹیٹس اپلوڈ کر رہے ہوتے
ہیں۔ checked into barber shop for
cutting بندہ پوچھے کہ باربر کی دکان بال کٹوانے کے لئے ہی
ہوتی ہے، کھانا کھانے کے لئے تھوڑی ہوتی ہے۔ FB جنریشن کی
حالت اس وقت قابل رحم ہوتی ہے جب کسی ایسی جگہ ہوں کہ
جہاں wifi کے سگنل نہ آ رہے ہوں۔ اور ڈیٹا نیٹ ورکنگ کی
سپیڈ بھی بہت کم ہو تو ان کی حالت ''ہیرونچی'' جیسی ہوتی ہے۔
فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ ہیرونچی نشہ نہ ملنے پر جسم کو کھجا رہا ہوتا
ہے جبکہ فیس بک کے ''پوبچے'' بار بار ٹچ سکرین کو کھجاتے دکھائی
دیتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں FB ہیرونچی اپنی اپنی ''کھوہ''
سے نکلتے ہیں اور فیملی کے بڑھے بوڑھے سے علیک سلیک
بڑھاتے ہوئے بہتر محسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یار ''بڑے
اچھے لوگ ہیں کبھی کبھار ان سے بھی ملنا چاہیے۔''

جہاں فیس بک کے بہت کے نقصانات ہیں وہاں کچھ
فائدے بھی ہیں کہ اب خواتین کو دوسروں کی ''ٹوہ'' میں نہیں رہنا
پڑتا۔ FB سے سب پتہ چل جاتا ہے۔ کہ کس ''دشمن'' نے کون سا
اور کس رنگ کا سوٹ اور لپ اسٹک لگا رکھی ہے، کہاں کہاں چگلی
میٹنگ ہو رہی ہے اور آئندہ کس کے ہاں چگلی میٹنگ ہو گی وغیرہ
وغیرہ۔ گویا سب کا راز افشاں کرنے والی کتاب کا نام ہے فیس
بک۔ یہ واحد کتاب ہے جسے بچے، جوان، اور طالب علم بڑے
شوق سے پڑھتے ہیں جبکہ بڑے بوڑھے اور ان پڑھ اسے تجسس
سے دیکھتے ہیں۔ اور ''موج مزہ'' کرتے ہیں۔ کہ ''بابوں'' کا
وقت اچھا گزر جاتا ہے۔

ہپی نوجوان

ہپی نوجوان ایسے بچے جو اپنے حال میں مست اور happy
رہتے ہوں۔ گھر کے حالات کتنے ہی آسودہ ہوں، شکل وصورت
، وضع قطع سے یہ مفلوک الحال ہی نظر آئیں گے۔ ہپی ایسی نسل ہے
جو دکھنے میں ہی مخلوط النسل، سوچنے سمجھنے میں مخبوط الحواس، عادات

میں مخلط اور تعلیم میں مکمل پاکستانی ہوں، تو آپ بلا جھجک ان پر
تہمت خاص لگا سکتے ہیں کہ یہی وہ نوجوان ہیں جو نہ HE ہے اور

نہ SHE، بس mix crop ہے۔ یعنی بال نسل افریقی، صاف ستھرائی میں سائبیرین، کپڑے گوری نسل، گویا آپ مختصراً کہہ سکتے ہیں کہ تازہ "جامن" کو کسی مٹی کے "کجے" میں ڈال کر نمک لگا کر shake کرنے سے جو حالت "جامنوؤں" کی بنتی ہے۔ یا چھلے ہوئے سنگھاڑے جیسے باہر نکل کے آتی ہے، ایسی ہی حالت سے ملتے جلتے ہوتے ہیں یہ ہپی بچے۔ ایسے بچوں کی "پنیری" پرائیویٹ ہائی سکول میں جنم لے کر یونیورسٹی میں فصل پک کر تیار ہو جاتی ہے۔ اگر آپ بھی اپنے اردگرد نظر دوڑائیں تو دو چار سے آپ کا بھی واسطہ پڑ سکتا ہے۔

اوازار نوجوان

یہ وہ نوجوان ہیں جو ساس کے مظالم سے تنگ بہو کی مانند ہوتے ہیں۔ "سستی اور سری زدہ" یہ بچے ہر وقت ہر کسی سے

نالاں و ناراض ہی رہتے ہیں۔ ماں کام کا کہہ دے تو اکتائے ہوئے، بابا پڑھنے کی تلقین کرے تو اوازار، دوست یار، پکنک کا کہہ دیں تو منہ پہ بارہ کا ہندسہ، بڑی مشکل سے کھانے کا وقت سستی کے حصار سے نکال پا کر نکال پاتے ہیں۔ ہمیشہ خیالی و تصوراتی دنیا میں فل نمک مرچ پلاؤ، بریانی کے خواب و خیال میں رہتے ہیں۔ ایسے نوجوانوں کو سستی زدہ، سری نما، دیمک شدہ بھی کہہ لیں تو ان کے کانوں پہ جوں تک نہیں رینگتی بلکہ پورا سر جوں زدہ

محض سستی کی بنا پہ ہو جاتا ہے۔

تعلیمی نوجوان

ایسے نوجوانوں کی تعداد اب آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ تعلیمی بچے ہی اصل میں تعظیمی بچے ہوتے ہے۔ انہیں آپ پڑھاکو بچے اور "بی بے" بچے بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایسے بچے "خرچیلے

کم ٹھچرے" زیادہ ہوتے ہیں۔ اپنی کتابوں اور دوسروں کی پاکٹ پر ہمیشہ نظریں جمائے رکھتے ہیں۔ تعلیمی نوجوان ٹیوشن فری، نوٹس فری، گائیڈ فری پاکٹ فری اور مال مفت کے لئے ہر کسی سے فری ہو جاتے ہیں۔ ایسے "گگھو قسم کے گول مٹول بچے" اب ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ حکومت وقت کو چاہئے کہ ایسے بچوں کی نسل محفوظ کرنے کے لئے "تعلیمی ہیچریاں" قائم کرے تاکہ تعلیمی تاریخ میں ہم تاریک ہونے سے بچ جائیں۔

مراد علی شاہد صاحب کا بنیادی طور پر تعلق کمالیہ (پاکستان) سے ہے جبکہ سترہ برسوں سے بسلسلۂ روزگار قطر میں مقیم ہیں اور ایک پاکستانی کالج میں بطور صدر شعبۂ پاکستان اسٹڈیز فرائض منصبی ادا کر رہے ہیں۔ پسندیدہ اصناف افسانہ نگاری اور طنز و مزاح ہے۔ "قندِ شیریں" کے عنوان سے کالم نگاری کرتے ہیں۔ فکاہیانہ و انشائیانہ اندازِ تحریر میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ "ارمغانِ ابتسام" میں خاصی مستقل مزاجی سے لکھ رہے ہیں۔

کائنات بشیر، جرمنی

کر سیر پنجاب دی

میں اسٹیشن پہنچا تو گاڑی پلیٹ فارم پر لگ چکی تھی۔ لوگوں کی افراتفری، قلیوں کی بھاگ دوڑ، سامان کی بہتات، بچوں کا ہنگامہ، منظر جم چکا تھا۔

لوگ اچھا کھانے پینے کے شوقین ہوتے ہیں یا کتابیں پڑھنے کے شائقین۔۔۔ لیکن میں نے ایک نیا شوق پال رکھا ہے۔۔۔ قریہ قریہ گھومنا۔۔۔ بستی بستی پھرنا۔۔۔ نئے نئے مقامات کھوجنا اور وہاں پہنچ جانا۔ بھئی اللہ کی بنائی اس کائنات میں گھومنا بھی تو ضروری ہے۔ کیا پتہ، آخرت میں اللہ میاں کوئی سوال اس کے متعلق بھی کرلیں کہ ''اے عباد۔۔۔! میری بنائی اس شاندار کائنات کی کھوج کیوں نہیں کی اور کولہو کے بیل کی طرح اپنے روز وشب میں ہی کیوں مصروف رہے؟''

اور پھر میرے پاس سوائے بغلیں جھانکنے کے کوئی آپشن ہی نہ رہے بلکہ اِک نیا سبق پڑھنے کو ملے۔۔۔ ''اے اللہ کے بندے۔۔۔! یہ بہتے ندی نالے، خوبصورت جھرنے، دریا، اونچے پہاڑ، سرسبز وادیاں، فطرت کے نظارے تیرے لیے ہی بنائے گئے تھے۔۔۔ جن سے تو نے کچھ فائدہ نہ اٹھایا۔۔۔ واقعی مردِ ناداں پہ کلامِ نرم و نازک ہے بے اثر۔۔۔!''

سو یہ سبق میں نے ایڈوانس میں ہی پڑھ لیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ قیامت کے روز اتنے لوگوں کے سامنے اپنی بے عزتی نہیں کروانی۔۔۔ اس لیے بیوی بچوں کے شور مچانے کے باوجود میں چند دنوں کے لیے انہیں تیاگ کر آگے بڑھ جاتا ہوں۔

ویسے بھی میں ان لوگوں میں ہرگز نہیں آتا کہ خوشی ملے تو سٹریو ہائی فائی آن کر کے گانوں کے ساتھ بے ہنگم اچھل کود کرنے لگوں۔ موڈ خراب ہو، طبیعت بیزار ہو تو کمرہ بند کر کے اداس، غمگین گانے سننے لگوں۔ تکیے میں منہ چھپا کر دنیا والوں سے ناراض ہو کر ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں۔ بلکہ میرے سارے مسئلوں کا بہترین حل مجھے فطرت ہی مہیا کرتی ہے۔ خوش ہوں تو میں لمبی سیر کو نکل جاتا ہوں۔ برستی بارش میں بھیگ کر راحت محسوس کرتا ہوں۔ غمگین ہوں تو آسمان پہ ٹانکے چاند کو تکتا رہتا ہوں اور شاعر کے احساسات سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور اس

سے بھی بڑھ کر ایک نادر نسخہ میرے پاس موجود ہے۔۔۔ میں اپنا رُک سیک پیک کرتا ہوں۔ گھر والوں کو بائے بائے کہتا ہوں اور چند دنوں کے لیے گھر، محلے بلکہ منظر سے ہی غائب ہو جاتا ہوں۔ ایک نئی تلاش مجھے اپنے ساتھ لیے لیے پھرتی ہے (یہ علیحدہ بات ہے کہ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں شائد عمرہ کرنے گیا ہوں)

اِس اچانک کی مسافت ڈھونے کے لیے میں اپنی ذاتی سواری استعمال نہیں کرتا۔ کار گیراج میں بند کر کے چند دنوں کے لیے اسے بھی اپنی زندگی سے ہٹا دیتا ہوں اور پھر سفر میں جو بھی سواری ملے، اُسے استعمال کرنے میں عار نہیں سمجھتا۔ ٹرین، بس، ویگن، کوچ، چن چن، تانگہ۔۔۔ بلکہ اگر لفٹ جائے تو کیا ہی بات ہے۔ لوگ کہتے ہیں جوانی کا حج بڑھاپے کے حج سے کہیں بہتر ہے۔ تو میرا یہ ماننا ہے کہ دنیا دیکھنے کے لیے بھی صرف جوانی ہی عمر کا بہترین حصہ ہے۔ کم سے کم ہڈیاں تو پوری سلامت ہوتی ہیں ناں۔۔۔ تھوڑا سا سفر کرنے اور اونچائی چڑھنے کے بعد کھڑ کنے تو نہیں لگتیں۔۔۔ سانس دھونکنی کی طرح چلنے تو نہیں لگتا۔۔۔ اور نظر بھی دور تک کا منظر لپیٹ لیتی ہے۔ پھر بندہ اپنا بوجھ (رُک سیک) بھی خود بآسانی ڈھو سکتا ہے۔

ویسے بھی اللہ کی بنائی اس دنیا کا حصہ بنے شروع کے چند سال تو بس ایویں ہی بیت گئے تھے۔ ایک بے خبری، لاعلمی کے عالم میں، جس کا افسوس تا زندگی رہے گا کہ وہ ہماری کسی گنتی میں نہ آئے۔ ہم تھے بھی اور نہیں بھی۔ یا پھر ہم وہاں تھے جہاں ہمیں اپنی خبر نہ تھی۔۔۔ درحقیقت لوگوں کو دنیا سے چلے کے بعد کے زمانے کی فکر ہوتی ہے۔

ہمارے بعد بھی محفل میں افسانے بیاں ہوں گے
بہاریں ہم کو ڈھونڈیں گی نہ جانے ہم کہاں ہوں گے

جبکہ ہمیں دنیا میں آنے سے پہلے کے زمانے کی فکر ستاتی ہے۔ اتنے کارنامے اور عظیم جنگیں ہمارے بغیر ہو گئیں۔ پانی پت کی لڑائیاں تک لڑی گئیں۔۔۔ مغلوں نے اتنے عیش و عشرت کی زندگیاں بسر کیں۔۔۔ انار کلی، سلیم کی محبتی کہانی اور وہ چاندنی راتیں۔۔۔ پر ہم نہ تھے۔۔۔ صد افسوس، تب کے زمانے نہ جانے کیسے ہوتے ہوں گے۔۔۔ سماج کیسا ہوتا ہوگا۔۔۔ معاشرے کیسے تشکیل پاتے ہوں گے۔۔۔ لوگوں کا ایک دوسرے کے ساتھ کیا بیوپار ہوتا ہوگا۔۔۔ من و سلوٰی نہ سہی پر صاف، تازہ ہوا اور خالص کھانے تو ملتے ہوں گے۔ لوگ گلٹ فری ایٹنگ کرتے ہوں گے۔ پلوشن تو ہوتی نہ ہوگی۔ لوگوں کو آفتاب، مہتاب بھی کثیف فضا کے بغیر نظر آتے ہوں گے۔ ہاں جی، کیا بات ہوتی ہو گی، سادہ قوموں کے سادہ لوگوں کی جو ہاتھی، گھوڑے، اونٹ پر چڑھ کر جنگیں تلوار اور تیر کے بل پر جیت لیتے تھے۔

تب گولی تھی نہ کلاشنکوف، بم تھے نہ ایٹم بم۔۔۔، نہ جانے صبحیں کتنی سُنہری ہوتی ہوں گی اور شامیں کتنی سُرمئی۔۔۔ سورج آب و تاب سے نکلتا ہوگا۔۔۔ بارش گنگناتی زمین پر اترتی ہوگی۔۔۔ چاند یونہی جگمگاتا ہوگا۔۔ تارے مسکراتے ہوں گے۔

پہلے ہم ویسے ہی صدیوں باری سے لگے رہے۔ جب وجود میں آئے تو خود کو برصغیر پاک و ہند کے ملک پاکستان کے بڑے صوبے پنجاب کے مشہور و معروف شہر لاہور میں پایا۔ جس سے ہماری شخصیت کے ساتھ خود بخود ایک لاہوری ٹیگ جڑ گیا۔ (جیسے لکھنو والوں کے ساتھ جڑ جاتا ہے) جس پر بعد میں ہم ہمیشہ اِتراتے رہے۔۔ ویسے اِس بات کے لیے ہمیشہ اماں، ابا کے مشکور رہے کہ وہ لاہور جیسے زندہ دل لوگوں کے شہر میں سکونت پذیر تھے۔۔۔ اور ہم کسی ''ماڑے جیڑے'' شہر میں پیدا نہیں ہو گئے ورنہ اگر وہ چیچو کی ملیاں میں رہتے تو ہم نے کیا کر لینا تھا۔ ہم بھی چپ چاپ بغیر کسی احتجاج کے چیچو کا ایک اٹوٹ اَنگ بن جاتے اور کسی گمنام گوشے میں پڑے رہتے۔

خیر ایک جگہ ٹکنا ہمیں پھر بھی نصیب نہ ہوا۔۔۔ ہمارے قدموں تلے تو زمین ٹریڈمل کی طرح بچھی تھی۔ پاؤں میں بلیاں بندھی تھیں۔ آنکھوں میں اِک پیاس تھی اور دل میں انہونی خواہش۔۔۔ جبھی ہم بہتوں سے ہٹ کر اک نئی راہ کے مسافر نکلے جس کی قسمت میں مسافت در مسافت لکھی گئی تھی۔ سیر سپاٹے کے شوقین، رنگین گرین نظاروں کے شیدائی، دل ہر دم چاہتا تھا، نیا دن ہو نئی رات ہو۔۔۔ انوکھی صبح ہو رنگین شام ہو۔۔۔ نئی جگہ ہو، نیا

دیار ہو۔ جبکہ یہ ویلوں کا شوق نہ اماں میں تھا نہ ابا میں۔۔اور نہ ہی اتنے بڑے خاندان میں کوئی آزاد منش، آوارہ گرد گزرا تھا۔ پر نہ جانے کیسے یہ ہماری ذات میں جستجو بن کر چلا آیا تھا۔ تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد اچھی بھلی چلتی زندگی میں اچانک بھونچال آجاتا۔ کسی نشئی کی طرح بدن ٹوٹنے لگتا۔ پھر یہ نشہ پورا کرنے کے لیے سفر کا منہ تاکنا پڑتا۔ اس آوارہ گردی کے لیے ویسے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ کسی دوست یار کا دل چاہے تو اٹھ کر ساتھ چل دیتا ہے ورنہ میں اور میری تنہائی اکثر یکجا ہوتے ہیں۔ ویسے دیکھا جائے تو میں اکیلا کہاں، رنگ برنگی دنیا نئے لوگ، نئے مقام میرے اردگرد ہی تو ہوتے ہیں۔

موجودہ سفر بھی میری اُنہیں مسافتوں کی کڑی ہے۔ سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ میری جیب میں ہے۔ رُک سیک میری کمر پہ۔۔۔ بلیو جینز کی پتلون اور آڈی ڈاس کی شرٹ، سر پر کیپ، نائک کے شوز۔۔۔ سن گلاسز، یہ میرا کوہ نوردی حلیہ ہے۔ موسم معتدل ہے۔ ویسے بھی سیاحت کے ماروں کو گرمی، سردی کی اتنی پرواہ نہیں ہوتی۔ سب موسم ایک سے لگتے ہیں۔۔ بس دل کی زمین پر شگوفے پھوٹے پڑتے ہیں۔ میرے مختصر سامان میں کپڑوں کے چند جوڑے، ایک دو تولیے، ایک عدد کیمرہ بمعہ ریل اور چند دیگر اشد چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ ویسے لازمی تو میرے لیے شیونگ کٹ بھی ہے۔۔۔ جسے میں ایک دو بار بھول گیا تھا تو واپسی پر شناخت گم ہو چکی تھی اور گھر والے گھر میں گھسنے نہیں دے رہے تھے۔ وہ تو محلے والوں کی مہربانی رہی کہ وہ مجھ کو گھر والوں سے زیادہ پہچانتے ہیں۔۔۔ کھانے پینے کے کوئی بھی اُلے تللے میں ساتھ نہیں رکھتا۔ مستنصر حسین تارڑ پارٹی کی طرح مجھے آٹا، دال، چاول، گھی کے کنستر ہر گھڑی ساتھ ساتھ اٹھائے پھرنا اور جگہ جگہ ان کی گنتی کرتے رہنا قطعاً پسند نہیں۔ پھر تو میں خود کو، کوہ نورد کم اور مزدور زیادہ سمجھنے لگوں گا۔ اور جہاں دوپہر، شام ہوئی کوئی نہ کوئی ڈھابہ، ہوٹل مل ہی جاتا ہے۔ وہیں رات گزر جاتی ہے اور میں پاؤں پسار لیتا ہوں۔

گزشتہ چند سالوں میں نے سفرنامے پڑھ کر شمالی علاقہ جات میں قریہ قریہ جھانکا۔۔۔ ہنزہ کی وادی کے خالص اور خوبصورت نظارے دیکھے۔۔۔ نانگا پربت کے نشیب میں ڈیرے ڈالے۔۔۔ کاغان، کالام، ناران کی خوب سیر کی۔۔۔ مری، سوات، نتھیا گلی تو میں اپنے اس جنون کے ابتدائی سالوں میں کئی بار جا چکا۔ پچھلے سال کوئٹہ کی پہاڑیاں اور مرغزار زیرِ مسافت رہے۔ اس سال کدھر جایا جائے یہ سوال کئی روز سے میرے ذہن میں اُتھل پتھل مچائے ہوئے تھا۔ لیکن ہنگ لگا نہ پھٹکوی، چند روز بعد میرا یہ پینڈنگ مسئلہ اپنے آپ حل ہو گیا۔ میں نے مزید کوئی دیر کیے بغیر آفس میں چھٹی کی عرضی جمع کرا دی، جو جلد منظور ہو گئی (یعنی کائنات بھی مجھے اپنی اور کھینچ رہی تھی اور حالات وسیلہ در وسیلہ بنا رہے تھے) ابتدائی مرحلے میں ریلوے اسٹیشن جا کر ٹرین کا ٹکٹ خرید کر سیٹ بھی ریزرو کروالی۔۔ میرے سفر کا پہلا قدم ٹرین بس، کوچ میں پڑتا ہے پھر آگے چل سو چل۔۔۔ پاؤں کے نیچے ریگزار ہوں یا سبزے بچھے ہوں، دونوں کے اپنے ہی رنگ اور مزے ہیں۔ سو اس سال کے نشے کا توڑ ہو چکا۔ گھر والوں کو میں نے سفر سے صرف ایک دن پہلے بتایا ورنہ ابا کی نصیحتیں، اماں کا لیکچر اور بیوی کا کلستا موڈ میری کوہ نوردی کا رنگ کچھ پھیکا کر دیتا۔

اب میرا یہ ٹور کدھر کا ہے؟

آپ ذرا یہ پزل کھیلئے، اور اس گانے پہ نظر ڈالیے جو گزشتہ دنوں گلی کی نکڑ پر پان والے کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے میرے کانوں میں پڑا تھا۔۔

چھک چھک گڈی کردی جاندی اوندے جاندے شہر
مڑ کے نیوں جمنا ماما، کر پنجاب دی سیر

کائنات بشیر کا تعلق لاہور سے ہے لیکن گزشتہ کئی سالوں سے جرمنی میں مقیم ہیں۔ مضمون نویسی اور شاعری اِن کا میدان ہے۔ ۲۰۱۳ء میں اِن کی کتاب ''چاند اور صحرا'' شائع ہوئی، مزید بہت سی کتابیں اشاعت پذیر ہیں۔ اخبارات اور رسائل میں باقاعدگی سے لکھ رہی ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کی مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

محمد شعیب کیلانی

ہیر تلغ بہت بندۂ حجام کے اوقات

ایک انسان کو اپنی تقدیر اور حجام سے کوئی مفر نہیں۔ جیسے تقدیر انسان کو آلیتی ہے ایسے ہی درازۂ گیسو کی ہلکی سی شکایت پہ حجام بھی انسان کو آڑے ترچھے ہاتھوں لیتا ہے لوگ کہتے ہیں گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کو بھاگتا ہے لیکن جب حضرت انسان اپنے سینے میں دبے صدیوں پرانے سربستہ رازوں کا بوجھ اٹھا اٹھا کے تھک جاتا ہے اور اسے اپنے رازوں کا بوجھ ہلکا کرنے کے واسطے ایک عدد مخلص رازداں کی ضرورت کا شدت سے احساس ستانے لگتا ہے تو وہ حجام کی طرف بھاگتا ہے۔

پاکستان میں حجام ہونے کے لئے بال کاٹنے کا ہنر آنا لازمی نہیں بس ضروری ہے کہ آپ اچھا سننے والے (listener) ہوں آپ بال بھلے کیسے ہی آڑے ترچھے کاٹ ڈالیے لیکن خیال رہے کہ بال کٹوانے والا جب گفتگو فرما رہا ہو تو اس دوران اس کی بات نہ کاٹی جائے کیونکہ اگر حجام نے بھی بال کاٹنے کی بجائے اس کی بات ہی کاٹنی ہے تو اسے حجام کے پاس آنے کی کیا حاجت ہے؟ یہ کام تو اس کی سخت گیر زوجہ حجام سے بدرجہا بہتر کر سکتی ہیں۔

حجام ملکی امن و سلامتی کے امین ہیں کیونکہ دشمنوں کے وہ خطرناک ترین ارادے جن تک ہمارے خفیہ اداروں کی ابھی تک رسائی نہیں ہو پائی، نہ جانے کون خفیہ ذرائع کی مدد سے ایسے خطرناک ارادوں کی چھوٹی سے چھوٹی اطلاعات تک بس ہمارے حجام ہی کی رسائی ممکن ہو پاتی ہے۔ یہ بات یقینی نہیں لیکن پھر بھی ایسا لگتا ہے کہ ملک کے دفاعی اداروں میں بھرتی جتنے بھی خفیہ ایجنٹ ہیں وہ یا تو حجام ہیں یا ان میں ایک حجام کی صفات عود کر آتی ہیں۔

حجام قیل وقال کا بندہ ہے اور ہر فن مولا ہے ایک مولوی کے بال کاٹتے ہوئے اک حجام مفتیٔ اعظم کے عہدہ سنبھال لیتا ہے اور سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے وہ حسن نثار ہے کرکٹ کی

خباثت انسانی فطرت کا خاص جوہر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اسے اچھی تعلیم مناسب تربیت اور سب سے بڑھ کر نیک صحبت کے زور پر دبایا جا سکتا ہے۔ عام مشاہدہ ہے کہ کبھی کبھار انسان دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر اپنی طبیعت میں یک گونہ اطمینان محسوس کرتا ہے۔ لہٰذا دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ کسی اور کو اپنا حال بتاتے وقت اسے یہ احساس ہرگز نہ دلایا جائے کہ قسمت کی دیوی آپ پر پوری طرح مہربان ہے۔ اگر آپ اپنی راحت کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی کلفت کا بھی ذکر کر دیں گے تو اس کے ذہن میں ایک انجانے سکون اور سرور کی کیفیت پیدا ہوگی اور آپ حسد سے بچ رہیں گے۔ آپ کی تکلیف میں آپ سے ہمدردی کرنے والے تو بہت مل جائیں گے لیکن کامیابی پر سچے دل سے اظہار ہمدردی کرنے والے ناپید ہیں۔ بقلم خود از ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

بات پہ وہی حجام سکندر بخت کی کرسی سنبھال لیتا ہے اور جب بال کٹوانے والا گفتگو شروع کر دے ہمارا حجام صدر پاکستان ہو جاتا ہے۔

حجام کے پاس دلائل کی کبھی کمی نہیں ہوتی اور اس کی دلیلیں ایسی مسکت ہوتی ہیں کہ ہر اک دلیل منکرین کے انکار کو اقرار میں بدلنے کے واسطے کافی ہے۔ یوں تو کان کے سوراخ کے قریب نوک دار قینچی کی موجودگی بھی حجام کی بڑی دلیلوں میں سے ایک دلیل ہے مگر یہ صرف باریش اور مولوی حضرات کیلئے کارآمد ہے کیونکہ مولوی داڑھی نہیں منڈواتے، تاہم بے ریش لونڈوں کے لئے حجام کی سب سے بڑی دلیل وہ ہے جو وہ داڑھی منڈتے شاہ رگ پہ استرے کے بلیڈ کی تیز دھار رکھ کے پیش کرتا ہے یہ ایسی دلیل ہے جس کے بعد مزید کسی حیل و حجت کی حاجت باقی نہیں رہتی۔

کچھ حجام صرف لوگوں کی دعوتوں میں کھانے خراب کرنے کیلئے مختص ہوتے ہیں جو نمکین دیگ میں ہر شے بڑے اہتمام سے ڈالنے کے بعد صرف نمک ڈالنا بھول جاتے ہیں اور اگر انہیں میٹھی دیگ بنانے کی فرمائش کیجائے تو آپ اسمیں میٹھے کے علاوہ باقی تمام ضروری اشیاء بڑی سہولت سے تلاش کر سکیں گے۔

ہمارے ہاں ایک حجام صاحب کو ایک عدد میٹھی اور ایک عدد چنوں والی نمکین دیگ بنانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ موصوف نمکین دیگ کی تکمیل پر سانس لینے بیٹھے ہی تھے کہ اس خیال پہ چونک گئے کہ دیگ میں چنے ڈالنا تو بھول ہی گئے ہیں۔ اللہ کی نعمت کی زیاں کاری کو از قبیل گناہ جانتے ہوئے چنے میٹھی دیگ کے سر منڈ دیے اور طرہ تماشا یہ کہ جب میٹھی دیگ کی تکمیل پہ سانس سیدھا کرنے کیلئے آرام کرسی پہ براجمان ہوئے تو اس خیال پر پھر سے چونک اٹھے کہ میٹھی دیگ میں میٹھا ڈالنا بھول گئے ہیں اللہ اللہ خیر سلا۔

دنیا عالم کی کوئی تہذیب کبھی حجام کے وجود سے خالی نہیں رہی تاہم مسلم تہذیب نے اک حجام کو جو مقام دیا ہے وہ دنیا کی کوئی دوسری تہذیب دینے سے قاصر رہی ہے کیونکہ ہم بچے کی پیدائش کے ساتویں ہی دن عقیقے کی رسمیں ادا کرنے کیلئے اک عدد حجام کے دست نگر ہو جاتے ہیں۔ وہ ادائیگی رسم کیلئے پہلے تو استرے سے حلق کرتے ہوئے بچے کے سر سے خون نکالنے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے اور پھر پورے انہماک سے کھانا خراب کرنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور من جملہ امور سے فراغت کے بعد بچے کو کٹ لگانے کے جرم میں ماں سے اور برا کھانا پکانے کے سبب دعوت میں آئے سبھی مہمانوں کی بددعائیں ڈھیر سارے پیسوں سمیت قبول کرتے ہوئے گھر کو سدھار جاتا ہے۔

محمد شعیب کیلانی کیلیانوالہ گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اردو ادب میں ایم اے کر رکھا ہے اور اسی چکر میں کبھی کبھار لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ زیادہ تر فکاہیہ ہی لکھا ہے کیونکہ ایسے ہمارے معاشرے میں عام مل ہیں سو وہ اپنی دوکان میں وہ مال رکھتے ہیں جس سے گاہکوں کے چہرے کھل جائیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' میں پہلی بار لکھ رہے ہیں۔

وفادار طوطا

م ص ایمن

دلاور فگار نے کہا تھا :

ایک صاحب توتے کے مرنے پہ یوں غمگین ہیں
جیسے دادا کو یہ غم ہو اس کا پوتا مر گیا
وجہ اس صدمے کی جب پوچھی تو وہ کہنے لگا
''طوطا'' چشمی رہ گئی دنیا میں ''توتا'' مر گیا

یہ توتا بے چارہ جو کسی زمانے میں ''ط'' سے طوطا ہوا کرتا تھا اور ابتدائی جماعتوں میں بچوں کو ط سے ہی پڑھایا گیا پھر حال کے اساتذہ کرام نے تحقیق کر کے بتایا کہ ط سے طوطا درست نہیں یہ 'ت' سے 'توتا' ہے۔ پھر اس کے بعد اردو کے مستعملین نے اسے ''ت'' سے توتا لکھنا شروع کر دیا۔ میں چونکہ اپنے اساتذہ کرام کا احترام کرتا ہوں اور خود کو ان سے زیادہ قابل نہیں گردانتا اس لیے چاہتا ہوں کہ اپنے اساتذہ کرام کے نقش قدم پہ چلتے ہوئے ''ط'' سے ہی طوطا لکھوں۔ تاہم حال کے اساتذہ کرام کی توجیہ بھی دل کو لگتی ہے کہ اسے 'ت' سے 'توتا' لکھا جانا چاہیئے۔ بقول مشتاق احمد یوسفی ''توتے کو اگر ''ط'' سے لکھا جائے تو ہرا ہرا نظر آتا ہے نہ صرف یہ بلکہ ط کو ذرا ڈھنگ سے لکھا جائے تو چونچ بھی نظر آنے لگتی ہے'' (دیباچہ 'خاکم بدہن')

ایک کاتب اپنی عادت سے مجبور تھا مسودے میں اپنی مرضی سے جملہ مسلط کر دیا کرتا تھا اس لیے اس کے پاس کام کم سے کم آتا تھا ایک بار ایک صاحب نے قران مجید دیا اور تاکید کی کہ تم اس میں اپنی مرضی سے کوئی اضافہ کوئی تبدیلی نہ کرنا یہ مقدس کتاب ہے اور اس میں کوئی بھی تبدیلی تمہیں گناہگار کر دے گی''

کاتب نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا ''توبہ توبہ! میں مسلمان ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ مقدس کتاب ہے۔ اس میں کوئی خامی ہوگی ہی نہیں میں تو مصنفوں کی خامیاں دور کیا کرتا ہوں اور لوگ مجھے بدنام کرتے ہیں''

بہرکیف وقت مقررہ پر جب وہ صاحب کتابت شدہ قرآن مجید لینے آئے تو انہوں نے سرسری پوچھ ہی لیا'' کیوں میاں! اس میں کوئی تصحیح تو نہیں کی''

''توبہ توبہ! کیوں گناہگار کرتے ہیں جی! میں اس میں کوئی تصحیح کیوں کرنے لگا'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں البتہ اس میں جابجا 'ابلیس' اور '' شیطان'' جیسے نام بھی لکھے ہوئے تھے میں نے سوچا کہ اس مقدس کتاب سے یہ ناپاک نام میل نہیں کھاتے اس لیے میں نے ان جگہوں پر آپ کے والد اور دادا کے نام لکھ دیے ہیں''

دلاور فگار کا قطعہ پھر ملاحظہ کیجیے!

دلاور فگار کا قطعہ پھر ملاحظہ کیجیے !

شاید سہوِ کتابت ہو یا شاید دلاور فگار نے خود ہی اس قطعے میں دو بار ''ت'' سے توتا اور ایک بار ''ط'' سے طوطا لکھا ہو۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو میری نظر میں ماضی کے اساتذہ اور حال کے اساتذہ کو راضی رکھنے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔

جی تو ہمارا بھی چاہتا ہے کہ ہم بھی کبھی طوطا اور کبھی توتا لکھیں ۔جی تو یہ بھی چاہتا ہے کہ آدھا تیتر آدھا بٹیر کردیں یعنی ''ط'' سے شروع کرکے ت پر ختم کردیں طوتا لکھیں لیکن توفیق کی بات دل کو لگتی ہے کہ ''ہمیں تو ط سے طوطا لکھنے سے منع کیا جارہا لیکن نئے پڑھنے والوں کو تاحنوز ''ط'' سے طوطا ہی پڑھایا جارہا ہے۔۔۔ان کے لیے کوئی متبادل کیوں نہیں ہے؟

آج کل کے پیش امام بھی پروفیسر ٹائپ کے افراد کی نکتہ چینی سے بچنے کے لیے (والضالین کو) ایک رکعت میں 'ولدوالین' اور دوسری رکعت میں 'ولذوالین' پڑھتے ہیں۔

یہ بات ٹھیک سہی کہ ''چونکہ 'ط' خالص عربی الاصل حرف ہے اور اس سے بننے والے تمام الفاظ اور وہ جملے یا اشیا کے نام عربی ہی قرار دیے جاسکتے ہیں جن میں 'ط' کا حرف شامل ہو اور چونکہ ''طوطا'' عربی زبان کا لفظ نہیں ہے اس لیے اسے 'ت' سے ''توتا'' کہنا ہی درست ہے جبکہ ''ط'' سے طوطا لکھنا ادبی بے ادبی ہے اور ماہرین اردو سے بغاوت!

پھر اس کا کیا کیا جائے کہ ''توتا'' لکھنے سے ''طوطے'' کی چونچ نہیں بنتی؟

یہ بھی سوچا جاسکتا ہے کہ اگر ''ط'' سے طوطا ہوا تو ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں گے، باقی کچھ نہیں بچے گا اگر ''ت'' سے توتا ہوا تو کم از کم چار نقطے باقی رہ جائیں گے سند کے لیے۔

کوئی کسی سے بے وفائی کرے تو اسے طوطا چشم کہا جاتا ہے اور یہ باور کیا جاتا ہے کہ ''طوطا بے وفا پرندہ ہے۔''

بے وفا کون ہے کون ہرجائی ہے
فیصلہ آج محفل میں ہو جائے گا

علامہ ابن جوزی نے اپنی کتاب ''کتاب الاذکیا'' میں لکھا ہے کہ ایک باز نے مرغ سے کہا کہ تو بہت بے وفا ہے، تو انڈے سے نکلتا ہے تو مالک کے گھر میں ہوتا ہے ۔مالک تیرے لیے دھوپ بارش سے بچاؤ کا سامان کرتا ہے۔ تیرے لیے خوراک کا بھی بندوبست کرتا ہے تو ہر وقت مالک کے گھر میں چگتا ہی رہتا ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ جب بھی مالک تیری جانب بڑھتا ہے تو تو جھکائی دے کر دائیں بائیں ہوجاتا ہے اور مالک کے ہاتھ نہیں آتا۔اور میرا یہ حال ہے کہ مالک مجھے جنگل میں سے شکار کرتا ہے مجھے اپنوں سے دور کردیتا ہے لیکن جب وہ اشارہ کرتا ہے تو میں اس کے اشارے پر اڑتا ہوا اس کے پاس آجاتا ہوں اور جب وہ مجھے کسی پرندے کے شکار کرنے کے لیے بھیجتا ہے تو اسے شکار کر کے خود نہیں کھاتا بلکہ اسی کو لا کر دیتا ہوں۔''

مرغ پہلے تو اس کی بات خاموشی سے سنتا رہا پھر بولا ''جس طرح میں اپنے ہم جنسوں کو سیخ پر پرویا ہوا دیکھتا ہوں اگر میری طرح تو بھی کسی باز کو سیخ پر پرویا ہوا دیکھ لے تو پھر میں جانوں گا کہ تو مالک کا کتنا وفادار ہے؟''

طوطا دنیا کی وہ واحد ہستی ہے جو انسان کے بارے میں وہ کچھ جانتا ہے جو انسان خود بھی نہیں جانتا۔یقین نہیں ہے تو فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے ''طوطا فال'' کے پنجرے پر جھولتے ہوئے طوطے سے اپنے بارے میں پوچھ کر دیکھ لیں۔

دو دوست جارہے تھے ،فٹ پاتھ پر ''طوطا فال'' والا بیٹھا تھا۔ ایک دوست فال کو درست تسلیم کرتا تھا جبکہ دوسرا اسے ڈھکوسلا، وقت کا ضیاع ،فضول خرچی، عقل کی کمی وغیرہ قرار دیا کرتا تھا۔

جو ''نہیں مانتا'' تھا وہ فال نکالنے والے کے پاس بیٹھ گیا جو ''قائل'' تھا وہ اس کی پیٹھ کے پیچھے کھڑا ہوا تھا، اسے اس چکر سے باز رہنے کی تلقین کررہا تھا۔ بولا ''چھوڑ یار! وقت کم ہے پہلے ہی دیر ہورہی ہے۔

نہ ماننے والے نے اس کی پروا نہ کرتے ہوئے ''نجومی'' سے پوچھا'' کتنے کی فال نکالتے ہو؟''

اس نے بتایا'' پانچ روپے میں ایک لفافہ''

نہ ماننے والے نے اسے دس روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا ''دو لفافے نکال دو''

کھڑے ہوئے دوست نے جو کہ فال وغیرہ کو' مانتا' تھا اس کی کمر پر اپنا گھٹنا چبھوتے ہوئے کہا'' میرے لیے نہ لے یار! اپنے لیے ہی فال نکلوا ! مجھے ضرورت نہیں ہے۔''

نجومی کو گمان گزرا کہ اگر ایسا ہوا تو دس روپے کے اس نوٹ میں سے آدھی رقم واپس کرنا پڑ جائے گی۔

نجومی کے سامنے بیٹھے ہوئے 'نہ ماننے والے دوست نے اپنے'' ماننے والے'' دوست کی پروا نہ کرتے ہوئے نجومی سے کہا۔

'' دو لفافے نکال ایک میرے لیے اور دوسرا اپنے لیے کہ تو کب تک فٹ پاتھ پر بیٹھا رہے گا؟''

طوطے پر یہ محض الزام ہے اور بنا سوچ سمجھے اسے بے وفائی کی علامت قرار دے دیا گیا ہے۔ دراصل یہ وفا ہی تو ہے!۔۔ جو اسے آپ کی قید سے نکل بھاگنے پر مجبور کرتی ہے!

اس کے مقابلے میں مرغ واقعی بے وفا پرندہ ہے جو مالک کے ہاتھ نہیں لگتا اور اسے جل دے کر نکل جاتا ہے۔ ہم اس ننھی سی جان،'' وفادار طوطے'' پر سے یہ داغ مٹانے کی کوشش کرتے ہیں کہ'' انسان سے'اس کی بے وفائی کو'' طوطا چشمی'' کیوں کہا جاتا ہے اس میں طوطے کا قصور کتنا ہے؟ قصور ہے بھی یا نہیں؟ اور یہ کہ اس کی بے وفائی میں انسان کا اپنا کتنا عمل دخل ہے؟

فرض کیجیے کہ ایک شخص کو کوئی بے قصور قید کر دے اس کے کھانے پانی کا اس کے آرام کا خوب خیال رکھے اسے کوئی تکلیف نہ ہونے دے، سال دو سال یا دس بارہ سال! اب بتائیے کہ جوں ہی اس قیدی کو موقع ملا تو وہ فرار ہو کر اپنے بیوی بچوں میں واپس آئے گا یا اسی حالت قید کو ترجیح دے گا؟

آشیاں جل گیا گلستاں لٹ گیا، ہم قفس سے نکل کر کدھر جائیں گے
اتنے مانوس صیاد سے ہو گئے، اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے

جی حضرت! جونہی اس قیدی کو موقع ملا وہ 'فرار ہو کر' اپنوں میں چلا جائے گا۔

کچھ یہی حال اس طوطے کا بھی ہے جو اپنوں سے دور ہو کر کسی انسان کی قید میں پھنس جاتا ہے جونہی اسے موقع ملا وہ بھی اڑ کر اپنوں میں چلا گیا۔ بقول غالب ؎

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

کیا انصاف ہے کہ انسان کسی کی قید سے نکل بھاگے تو اسے سراہا جائے اور اگر یہی حرکت طوطا کرے تو اسے'' بے وفا'' کہہ دیا جاتا ہے۔ خود ہی انصاف کیجیے کہ طوطے کو آپ نے اپنے بچوں سے کھیلنے کے لیے، یا اپنے آمرانہ جذبے کی تسکین کے لیے'' بے قصو' قید کر رکھا تھا۔

آپ کو یقین ہے خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ کی قید میں ذرا سی بھی کوتاہی ہوئی تو یہ پرندہ نکل بھاگے گا۔ اپنے دوستوں رشتہ داروں پر'' اپنی محبت'' کا بھرم قائم رکھنے کے لیے آپ طوطے کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ'' یہ جنگلی پرندہ'' آپ سے کس قدر مانوس ہے کہ آپ کے گھر آزادی سے آتا جاتا ہے لیکن طوطا اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرتا کہ آپ نے اس کے پر کاٹے ہوئے ہیں! وہ اُڑا بھی تو کتنا اڑے گا؟

ظالم نے پر کتر کر قفس سے رہا کیا
گر کر وہ آسمان سے اٹکے کھجور میں

چنانچہ جونہی آپ نے یہ گمان کیا کہ اب طوطا'' پکا پکا'' آپ کے گھر کا فرد ہو گیا ہے یہ کہیں نہیں جائے گا تو آپ اس کے پر کاٹنا چھوڑ دیتے ہیں۔ طوطا آپ کے گھر کی حدود میں آزادی سے آتا جاتا ہے نیچی پرواز سے منڈیر تک بھی ہو آتا ہے۔۔۔ لیکن کب تک؟

جب اسے'' اپنے گھر'' اپنے بیوی بچوں کی اپنے ہم جنسوں کی یاد تڑپاتی ہے تو وہ اڑ کر اپنوں میں چلا جاتا ہے، گویا آپ کی قید سے نکل بھاگا دراصل ہم یہ سمجھتے ہیں کہ'' طوطے کو ہمارے گھر کوئی تکلیف نہیں ہے، بغیر محنت ومشقت لیے ہم اسے 'چوری' کھلاتے ہیں، مرچیں کترنے کے لیے دیتے ہیں اسے ہماری قید میں ہی رہنا چاہیے، بھاگنا نہیں چاہیے۔ اس لیے ہم 'اپنی شرمندگی

ڈھاپنے' کے لیے کہ طوطا ہمیں چھوڑ کر چلا گیا 'لوگ کیا کہیں گے؟ ۔۔۔ہم اس سے کوئی مشقت کرواتے تھے؟ اس کے کھانے پانی کا خیال نہیں رکھتے تھے؟اس لیے ہمارے رویئے سے تنگ آ کر چلا گیا؟ فوراً اسے ''سندِ بے وفائی'' دے دیتے ہیں ۔

ہر اک سے کہتے ہیں کیا داغ بے وفا نکلا
یہ پوچھے ان سے کوئی، وہ غلام کس کا تھا؟

جس طرح کوئی انسان کسی کی قید سے نکل کر اپنوں میں آجائے تو اسے مبارک باد دی جاتی ہے ۔اسی طرح یقیناً طوطا طویل یا غیر معینہ مدت کی سزا 'پوری' کر کے جب اپنوں میں جاتا ہے تو اپنے ہم جنسوں سے خوب خوب مبارکبادیاں وصول کرتا ہے ۔یقین نہیں ہے تو کبھی طوطے کے ساتھ اس کی فیملی میں ''جنگل' جا کر دیکھیں۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ طوطا ہم سے ہمارے بچوں سے مانوس ہے ہمارے ساتھ ہمارے گھر رہنے پر اسے کوئی اعتراض، کوئی تکلیف نہیں ہونا چاہیئے ۔اب یہ تا حیات ہمارے پاس ہی رہے گا لیکن ہمارے اندازے، ہمارے یقین کے قطعی برعکس اسے جونہی موقع ملا، وہ اڑ گیا۔

طوطا ہو یا کوئی بھی پرندہ ''انڈے میں قید'' ہوتا ہے، انڈے سے باہر آ گیا تو سمجھیں وہ آزاد ہے، اسے آزاد رہنا چاہیئے جس گھونسلے میں انڈے سے نکلا ہے اس گھونسلے کو وہ اپنا گھر نہیں سمجھتا جب وہ خود اپنے انڈے دینے کی عمر کو پہنچتا ہے تو اپنا گھونسلا خود بناتا ہے۔ماں باپ کے بنائے ہوئے گھونسلے پر حق وراثت نہیں جتاتا۔اپنے دیگر بہن بھائیوں کو اس گھونسلے سے بے دخل کرنے کی کوشش نہیں کرتا، یا دستبردار ہونے کی صورت میں ان سے اس گھونسلے کا حصہ نہیں مانگتا جب وہ اپنی ''جنم بھومی'' کو اپنا گھر نہیں سمجھتا تو اس سے یہ توقع رکھنا کہ آپ کے بنائے ہوئے پنجرے کو اپنا گھر سمجھے گا؟جب وہ آزاد ہے، اس کے پر ہیں تو اسے آزاد رہنا چاہیئے ۔ اسے کھلی فضا میں اڑتے رہنا چاہیے ۔فضا کی خوبصورتی ان پرندوں سے قائم ہے، اپنی قید میں رکھ کر اپنے بچوں کا کھلونا بنا کر اس پر ظلم نہیں کرنا چاہیے۔

''عالمی محقق برائے طوطا چشم'' فرماتے ہیں (اور یہ بھی اتفاق ہے کہ اس ''خود ساختہ'' عالمی محقق کی تحریر اس وقت آپ کے زیرِ مطالعہ ہے) کہ اس کی مشہور عالم ''بے وفائی'' کی دیگر وجوہات میں ایک تگڑی وجہ یہ بھی ہے۔۔۔

کند ہم جنس و با ہم جنس پرواز

ایک مولوی صاحب کا دوست اس کے گھر آیا دیکھا کہ ان کے پاس دو طوطے ہیں جو مختلف ذکر و اذکار میں مشغول رہتے ہیں۔کوئی گھر میں داخل ہوتا ہے تو اسے سلام کرتے ہیں اور پھر ذکر میں مشغول ہو جاتے ہیں ۔اس کا دوست یہ دیکھ کر بے حد متاثر ہوا۔اس نے کہا ''آپ نے طوطوں کو بہت اچھی تربیت دی ہے میرے پاس ایک طوطی ہے اسے بھی ایسا ہی بنا دو وہ گالیاں بہت دیتی ہے''

مولوی نے کہا کہ ''جو کچھ تم اسے سکھاؤ گے وہ وہی کچھ سیکھے گی تم نے اسے گالیاں ہی سکھائی ہوں گی، بہر حال تم اسے میرے پاس لے آؤ میں اسے سدھا لوں گا۔''

اُس کا دوست اپنی طوطی کو مولوی صاحب کے پاس لے آیا۔ مولوی صاحب نے اسے اپنے طوطوں کے پنجرے میں ڈال دیا۔اس وقت ایک طوطا سجدے میں تھا اور دوسرا تسبیح رول رہا تھا۔طوطی کو دیکھ کر طوطے نے تسبیح پھینک دی اور دوسرے کو لات مار کر چلایا ''اُٹھ اوئے !ہماری دعائیں قبول ہوگئی ہیں''

م۔ص۔ایمن کا تعلق کراچی سے ہے۔موصوف بہت اچھے افسانہ نگار اور بچوں کے ادیب ہیں اور بہت سے رسائل میں ان کی کہانیاں تواتر سے شائع ہو رہی ہیں۔بہت سی ادبی تنظیموں کے عہدیدار ہیں۔''بزمِ احبابِ ظرافت'' کے جوائنٹ سیکرٹری ہیں، جو کراچی میں خاصی فعال ہے اور کئی کامیاب محفلیں برپا کر چکی ہے۔بہت اچھا مزاح تخلیق کرتے ہیں۔اندازِ بیان میں شگفتگی اور شائستگی ہے۔''ارمغانِ ابتسام'' کے مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

اقبال حسن آزاد

چندہ

شہر میں یوم اقبال کے موقع پر ایک جلسہ منعقد ہو رہا تھا جس میں میں بھی مدعو تھا۔شام سات بجے میں جیسے ہی اپنے گھر سے تیار ہو کر نکلنے کو ہوا کہ تین باریش حضرات سامنے آ کھڑے ہوئے۔انہوں نے با آواز بلند مجھے سلام کیا او پھر باری باری مجھ سے مصافحہ کرنے لگے۔اس فوج ظفر موج کو دیکھ کر پہلے تو میں ذرا نروس ہوا پھر سنبھل کر ان کی جانب غور سے دیکھا۔یہ سب کے سب بقرعید کے خصی دکھائی دے رہے تھے۔ ہٹے کٹے، پلے پلائے اور چرب دار۔انہوں نے کافی قیمتی لباس زیب تن کر رکھے تھے۔میں نے آنے کا سبب دریافت کیا تو کہنے لگے کہ پروفیسر صاحب ! آپ کی بڑی شہرت سنی ہے لہذا ہم لوگ شرف ملاقات کے لئے حاضر ہوگئے۔ آپ سے گذارش ہے کہ آپ ہماری بات سن لیں۔ میں نے گھڑی پر ایک نگاہ ڈالی۔ مجھے پہلے ہی کافی تاخیر ہو چکی تھی۔ڈرائیور گیراج سے گاڑی نکال چکا تھا اور میرا منتظر تھا۔میں نے ان لوگوں سے معذرت خواہانہ انداز میں کہا کہ جناب مجھے دیر ہو رہی ہے ۔اگر آپ لوگ کل اسی وقت تشریف لائیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ان کے سربراہ نے خوش دلی کے ساتھ جواب دیا کہ کیوں نہیں جناب ! ہم لوگ کل حاضر ہو جاتے ہیں۔ان سے رخصت لے کر میں جلسہ گاہ میں پہنچا۔ پروگرام شروع ہو چکا تھا۔میں نے اپنی نشست سنبھالی اور آخر تک وہاں موجود رہا۔

دوسرے روز وقت مقررہ پر وہ حضرات پھر تشریف لائے۔ پہلے تو سبھوں نے نہایت بلند آواز میں مجھے سلام کیا اور پھر بڑی گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا۔میں نے اندر جا کر بیگم کو ان کے لئے چائے ناشتے کا انتظام کرنے کے لئے کہا اور خود ان لوگوں کے ساتھ جا کر بیٹھ رہا۔میر کارواں نے پہلے تو اپنا گلا صاف کیا اور پھر کہنے لگے ”پروفیسر صاحب!کل آپ کی تقریر سب سے زیادہ اچھی تھی۔“

میں نے حیرت سے ان کی جانب دیکھا ”آپ نے میری تقریر کہاں سے سُن لی۔“

”اصل میں ہم لوگ بھی آپ کے پیچھے پیچھے وہاں چلے گئے

تھے۔‘‘

’’اچھا؟‘‘

’’جی! تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ کل آپ نے سب سے عمدہ تقریر فرمائی۔‘‘

’’جی نہیں! کچھ لوگوں نے مجھ سے بھی بہتر تقریر فرمائی۔‘‘

’’آپ نے علامہ اقبالؒ کے جو اشعار سنائے وہ لاجواب تھے۔‘‘

’’یہ اشعار تو دوسرے مقررین نے بھی سنائے۔‘‘

’’لیکن آپ کے سنانے کا انداز منفرد اور جداگانہ تھا۔‘‘

مجھے ان حضرت کی باتیں سن کر ہنسی آرہی تھی۔ آخر میں نے کہا کہ حضور! مطلب کی بات کیجئے۔ وقت میرا بھی قیمتی ہے اور آپ کا بھی۔ تب وہ سنبھل کر کہنے لگے کہ ایسا ہے کہ بھاگلپور کے قریب ہم لوگوں نے ایک یتیم خانہ قائم کیا ہے۔ آپ سے مدد کی درخواست ہے۔ میں ان بچوں سے آپ کے اور آپ اہل و عیال کے لئے دعا کرواؤں گا۔

اِسی اثناء میں چائے آچکی تھی۔ میں نے ان سے چائے اور ناشتے کے ساتھ انصاف کرنے کے لئے کہا اور اندر جا کر کچھ رقم لا کر ان کے سامنے رکھ دی۔ وہ لوگ رقم لے کر چلے گئے۔

پھر تو ہر مہینے ان کے چکر لگنے لگے۔ میر صاحب خاصے چرب زبان تھے اور مجھے ان سے گفتگو کرنے میں مزہ آتا تھا۔ ایک خاص بات جو میں نے نوٹ کی وہ یہ کہ دوسرے مدرسوں یا یتیم خانوں کی طرح ان کے پاس کوئی رسید نہیں تھی اور وہ اپنے یتیم خانے کا جائے وقوع بھی ٹھیک طور پر نہیں بتاتے تھے لیکن پھر بھی میں یہ سوچ کر انہیں چندہ دیتا رہا کہ چلو کسی ضرورت مند کے پاس ہی جا رہا ہوگا۔

ابھی چند روز قبل کا واقعہ ہے۔ وہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ پہنچ گئے۔ ابھی چائے کا دور چل ہی رہا تھا کہ ان کا موبائل بج اُٹھا۔ انہوں نے اسکرین پر ایک نظر ڈالی تو ان کا منہ بن گیا۔ پھر انہوں نے فون کرنے والے کو درشت آواز میں ڈانٹنا شروع کیا ’’آپ ابھی تک یہیں ہیں؟ آپ کو تو میں نے کہا تھا کہ فوراً سے پیشتر یہاں سے نکل لیں...... نہیں نہیں، جمالپور نہ جائیں۔ وہاں آپ کے پیچھے لوگ لگے ہوئے ہیں۔ مونگیر بس اسٹینڈ سے کوئی بس پکڑ کر نکل لیں،...... بھاگلپور بھی نہ جائیں...... نوادہ، گیا یا بہار شریف چلے جائیں ...... بیگو سرائے یا کھگڑیا تو بھول کر بھی نہ جائیں، وہاں آپ کی جان کو خطرہ ہے...... اور ہاں میرا نمبر اپنے موبائل سے ڈیلیٹ کر دیں۔ میں کسی چکر میں پھنسنا نہیں چاہتا۔‘‘

وہ کافی دیر تک فون پر گفتگو کرتے رہے اور دوسری جانب موجود شخص کو ہدایتیں دیتے رہے۔

وہ اپنی فونی گفتگو میں اس قدر منہمک تھے کہ انہیں میری موجودگی کا احساس تک نہ ہوا۔ بات چیت ختم ہو جانے کے بعد جب وہ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگے تب ان کی نظر مجھ پر پڑی اور یہ سوچ کر ان کا چہرہ فق ہو گیا کہ میں نے ان کی ساری بات چیت سن لی ہے۔ اچانک وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے ’’اچھا پروفیسر! ابھی ہم لوگ چلتے ہیں۔ پھر ملیں گے۔ انشاء اللہ!‘‘

کافی عرصہ کے بعد کل وہ لوگ پھر میرے غریب خانے پر حاضر ہوئے تھے۔ میں اس وقت اردو فورم کی میٹنگ میں شریک ہونے کے لئے نکل رہا تھا۔ میں نے انہیں اپنا موبائل نمبر دیا اور کہا کہ میرے پاس آنے سے پہلے مجھے فون کر لیجئے گا۔ وہ میرا نمبر نوٹ کر کے چلے گئے۔ میں نے پہلے سوچا کہ چندہ دینے سے پہلے ان سے مدرسے کی رسید طلب کروں گا۔ پھر خیال آیا کہ نقلی رسیدیں چھپوانا کون سا بڑا کام ہے۔ اللہ اس قوم پر رحم فرمائے۔ آمین۔

اقبال حسن آزاد کا تعلق صوبۂ بہار (بھارت) سے ہے۔ بسلسلۂ ملازمت مونگیر میں مقیم ہیں۔ گزشتہ چالیس برسوں سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ اب تک افسانوں کے تین مجموعے ’’قطرہ قطرہ احساس‘‘ (۲۰۰۵)، ’’مردم گزیدہ‘‘ (۲۰۰۵) اور ’’پورٹریٹ‘‘ (۲۰۱۷) شائع ہو چکے ہیں۔ چوتھا مجموعہ ’’اوس کے موتی‘‘ زیر ترتیب ہے۔ ’’ارمغانِ ابتسام‘‘ کے خصوصی کرمفرما ہیں۔

نورم خان
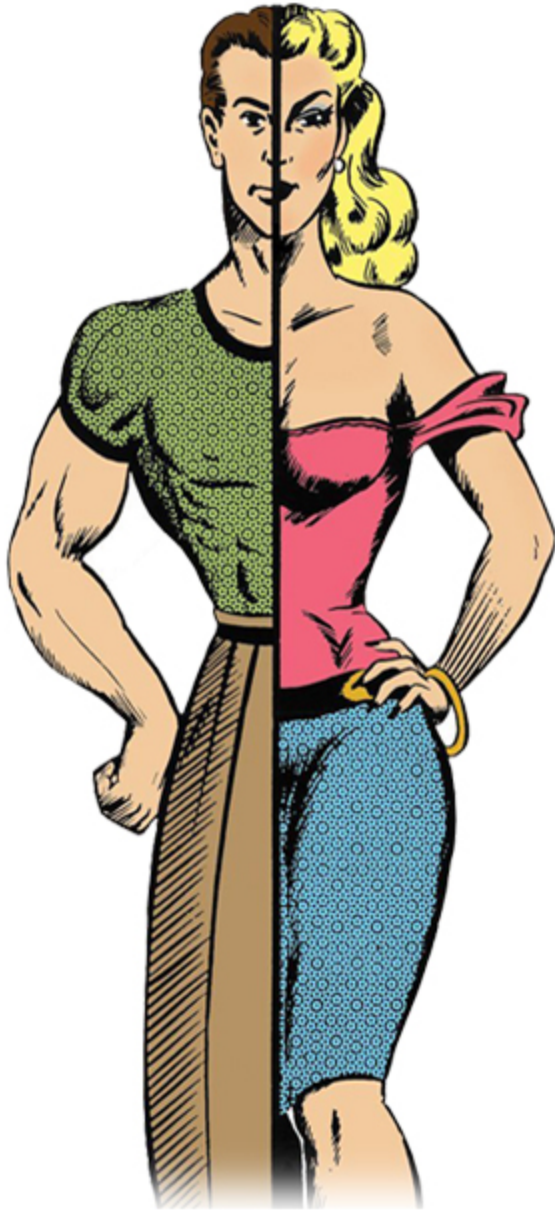
ایک اچھی خبر

کچھ عرصے پہلے ایک اچھی خبر آئی تھی کہ سپریم کورٹ نے ملک بھر میں خواجہ سراؤں کی رجسٹریشن کا حکم دے دیا ہے اور کسی تاخیری حربے سے بچنے کیلئے چار ہفتوں میں رپورٹ طلب کر لی ہے۔ عدالتِ عظمیٰ نے اس سلسلے میں دائر کردہ آئینی درخواست پر ریمارکس دیتے ہوئے صوبوں کو یہ ہدایت بھی کی تھی کہ وہ نہ صرف انکے کوائف اکٹھے کریں بلکہ یہ بھی بتائیں کہ انہیں کیا سہولتیں دی جا رہی ہیں۔

ہمارے معاشرے میں یہ ایک ایسا مظلوم طبقہ ہے کہ جن کا نام زبان پر آتے ہی لوگ ہنسی مذاق شروع کر دیتے ہیں اور یہ تک نہیں سوچتے کہ ایسے عالم میں، جب لوگ تیزی سے غربت کی لکیر سے نیچے جا رہے ہیں اور اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ بھی جبری ڈائٹنگ پر مجبور ہو گئے ہیں، ان بیچاروں کو زندگی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت ملک میں ان کی تعداد لگ بھگ ۶۰ ہزار کے قریب ہے۔ ماضی میں یہ لوگ شادی بیاہ اور پیدائش اور ختنے کے موقعوں پر ناچ گا کر بخوبی اپنا پیٹ پال لیا کرتے تھے لیکن کچھ حاسدین نے جانتے بوجھتے ایسا چکر چلایا کہ اب یہ بیچارے گھروں کے علاوہ مصروف چوراہوں اور دکانوں پر بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔

ہمیں بچپن کے زمانے میں ہونے والی اکثر شادیاں یاد ہیں جو گھروں کے سامنے میدان یا سڑک پر شامیانے کے اندر ہوا کرتی تھیں۔ اللہ جانے انہیں انکی اطلاع کون دے دیا کرتا تھا کہ جیسے ہی بارات آتی یہ اپنی پوری پارٹی کے ساتھ ڈھول بجاتے اور ٹھمکے لگاتے اس طرح پنڈال پر دھاوا بول دیتے جیسے کسی بوتل سے اچانک کوئی جن باہر آ جاتا ہے۔ ان کی ٹائمنگ پر عش عش کرتے

وہ مہمان بھی حیران رہ جایا کرتے تھے جو اپنی سادگی میں دعوت نامے پر درج وقت کے مطابق آپہنچتے تھے اور اس کے بعد گھنٹوں پنڈال کے اندر بیٹھے یا تو جمائیاں لے رہے ہوتے یا ان موٹے موٹے مچھروں کو بھگانے میں ناکامی کے بعد جھنجھلا کر اتنی زور سے انہیں چکی کے دو پاٹوں یعنی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان ہلاک کرنے کی کوشش کرتے کہ ہتھیلیاں کھول کر دیکھتے تو مچھر تو غائب ہوتا لیکن تالی بجا کر مچھر مارنے کی زوردار آواز سے اردگرد کے سارے لوگ بے اختیار چونک کر انہیں گھورنے لگتے تھے۔ پھر خدانخواستہ یہ واقعہ عین اس وقت پیش آتا جب خواجہ سراؤں کی بارات تالیاں بجاتی نمودار ہوتی تو وہ سنجیدہ حضرات بھی، جو کچھ دیر قبل ان صاحب سے حالاتِ حاضرہ پر تبادلۂ خیال میں مصروف تھے، مشکوک انداز میں انہیں گھورنے لگتے کہ کہیں ان کا تعلق بھی اسی پارٹی سے نہ ہو جو ابھی نازل ہوئی ہے۔ تب جھینپ مٹانے کو تالی بجا کر مچھر مارنے والے صاحب میز کے نیچے جھانکنے لگتے تاکہ گرمی سے تنگ آ کر اتارے ہوئے جوتے پہننے کے بہانے شرمندگی چھپا سکیں۔

شادی بیاہ میں اس طرح آدھمکنا اور ناچ گانے کے بعد نذرانے وصول کرنا تو عام سی بات تھی۔ زیادہ سے زیادہ کمائی کے انہیں اور بھی گر معلوم تھے۔ وہ خاندان کے چاچا، چاچی، ماموں، مامی، خالو، خالہ، دادا، دادی اور نانا، نانی کے علاوہ دولہا کے دوستوں کے نام لے لے کر وہ شور مچاتے کہ لوگ اپنی جان چھڑانے کو کچھ نہ کچھ دینے میں بالکل دیر نہ لگاتے۔ کچھ منچلے بلاوجہ ہی ان پر نوٹوں کی بارش کرتے جبکہ مالی لحاظ سے غیر مستحکم حاضرین بھی پیچھے نہ رہتے اور چونی، اٹھنی کے سکے ان پر تاک تاک کر پھینکتے۔ اس طرح شادی کا فنکشن اچھا خاصا میلہ کا سماں پیش کرنے لگتا تھا۔ اتنے قلیل وقت میں اتنی کثیر آمدنی دیکھ کر بعض اوقات ہم بھی پکا ارادہ کر لیتے تھے کہ بڑے ہو کر ہم بھی خواجہ سرا بنیں گے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار ابو کے عزیز دوست

مکرم صاحب نے جب پیار سے گال تھپتھپاتے ہوئے ہم سے پوچھا تھا کہ ''بیٹا! آپ بڑے ہوکر کیا بنو گے''؟۔۔۔تو ہم نے بغیر ہچکچائے فوراً جواب دیا تھا''ہم بڑے ہوکر خواجہ سرا بنیں گے۔''

یہ سن کر ابو کا جو حال ہوا، سو ہوا، مکرم صاحب کا تو یہ حال تھا کہ ہمارے عجیب وغریب ارادے پر ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور وہ اس طرح کانپے کہ ان کی چائے کی پیالی چھلک گئی۔تب ابو نے بات سنبھالی: ''بڑا شریر بچہ ہے۔'' اور ہمیں ڈانٹا کہ بڑوں سے ایسی باتیں نہیں کرتے۔رہے ہم۔۔۔تو ہم ان کی اس بات پر کافی عرصے پریشان رہے کہ آخر ہم نے کونسی شرارت کی تھی؟

خیر، ان خواجہ سراؤں سے ہماری جذباتی وابستگی کا یہ عالم تھا کہ ہم اُن کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔اس تحقیق کے دوران ہمیں ایک اور حیرانی کا سامنا کرنا پڑا۔شادی بیاہ میں جو دھوم دھڑ کا ہوتا ہے اسے سن کر تو یہ آجاتے ہوں گے مگر جب کسی کے یہاں بچے کی پیدائش یا ختنے کا معاملہ ہو تو ٹھیک اسی روز، اسی گھر میں یہ کیسے آجاتے ہیں؟ بلکہ ان کی پختگی اور یقین کا یہ عالم ہوتا تھا کہ گلی میں داخل ہوتے ہی گانا بجانا شروع کردیتے تھے۔ کافی غور وخوض کے بعد یہی سمجھ سکے کہ ان موقعوں پر بچہ خود ہی رو رو کر آسمان سر پر اٹھائے اور انہیں دعوتِ رقص وموسیقی دینے پر بضد ہو تو کوئی بھی آسانی سے ان تک پہنچ سکتا ہے۔

خیر یہ اچھے دنوں کی باتیں ہیں۔اس تحریر کے شروع میں ہم نے جن حاسدین کا ذکر کیا ہے انہوں نے رفتہ رفتہ ایسا چکر چلایا کہ شادی بیاہ کے لئے پنڈالوں کی جگہ بڑے بڑے میرج ہال اور شادی لان بنالئے گئے اور پیدائش اور ختنے کے لئے ہسپتالوں میں خصوصی شعبے قائم کردیئے گئے۔پھر وہ دن ہے اور آج کا دن کہ یہ بیچارے رُل کے رہ گئے ہیں، عالیشان فنکشنوں سے فٹ پاتھ پر آگئے ہیں اور اب یہ حال ہے کہ مہنگائی کے اس دور میں، جب بات کرنے اور پیغام بھیجنے پر بھی ٹیکس لگایا جاچکا ہے، ان بیچاروں کو بھی نہیں بخشا گیا اور میک اپ کے سامان پر ٹیکس میں حد سے زیادہ اضافہ کرکے ان کی زندگی اجیرن کردی گئی ہے۔حالانکہ حکومت بھی جانتی ہے کہ بغیر میک اپ کے ہماری خواتین جن مسائل کا سامنا کرتی ہیں ان سے زیادہ مسائل کا سامنا ہمارے خواجہ سراؤں کو ہے، یعنی خواتین تو بغیر میک اپ کے دو چار گھنٹے گزار سکتی ہیں مگر ان خواجہ سراؤں کے کاروبار کا دارومدار ہی میک اپ پر ہے۔اب یہ ہمارے اربابِ اقتدار ہی بتائیں کہ کاسمیٹکس پر بھاری ٹیکس کے بعد یہ بیچارے کھائیں گے کیا اور لگائیں گے کیا؟

ایسے میں سپریم کورٹ نے بروقت اس کیس کی سماعت شروع کرکے امید کی ایک نئی کرن پیدا کردی تھی۔اور چاروں صوبوں کو حکم دے دیا گیا تھا کہ سماجی بہبود کے محکمہ کے ذریعے سروے کرکے ان کے کوائف اکٹھے کریں اور رپورٹ میں ان حالات کی نشاندہی کریں جن میں خواجہ سرا زندگی گزار رہے ہیں، لیکن لگتا ہے پروفیشنل جیلسی کی وجہ سے اس معاملے کو بھی دبا دیا گیا ہے کیونکہ اس کیس کی سماعت کے دوران ایک اور حیران کن بات یہ سامنے آئی تھی کہ ملک میں خواجہ سراؤں کی اتنی کثیر تعداد کے باوجود نہ تو انہیں ایم این اے کا الیکشن لڑنے کی اجازت ہے نہ ہی ووٹرز لسٹ میں ان کا نام آتا ہے۔دوسری باتوں کا تو ہمیں علم تھا مگر یہ بات ہمارے لئے شدید حیرانی کا باعث بنی ہے کیونکہ انتخابات اور اسمبلی کے حوالے سے ایسی کسی زیادتی کے بارے میں ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔اگر واقعی یہ بات سچ ہے کہ ہماری اسمبلیاں ان سے خالی ہیں تو یہ ہمارے لئے بہت شرم کی بات ہے۔تاہم ہمیں امید ہے کہ بھارت کے خواجہ سراؤں کی طرح یہاں بھی انہوں نے مردانگی دکھائی اور اپنے موقف پر ڈٹے رہے تو ایک نہ ایک دن ضرور اپنے حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے!

نورم خان (نور محمد خان) کا تعلق کراچی سے ہے۔طنز و مزاح ان کا میدان ہے۔نثرِ لطیف میں نہایت شستہ اندازِ تحریر کے مالک ہیں۔ اخبارات میں طویل عرصہ سے مضامین اور کالم نگاری کے ''مرتکب'' ہو رہے ہیں۔فیس بک پر طنز ومزاح پر مبنی ایک گروپ کے منتظمِ اعلیٰ بھی ہیں۔برقی مجلّے ''ارمغانِ ابتسام'' میں خاصی مستقل مزاجی سے لکھ رہے ہیں۔

سالک جوہر

سرکار نامہ

پہلا منظر یہ ایک انسپکٹر صاحب کا بنگلہ ہے۔ انسپکٹر کا جوان بیٹا اپنی ماں کو آواز دیتے ہوئے آتا ہے ”امی، امی جی۔۔۔ کہاں ہو آپ؟“

”جی بیٹا کیا بات ہے۔۔۔ میرے لاڈلے چاند!“ ماں کی ممتا امڈ آئی ہے۔

”امی جی۔۔۔ میں کالج جا رہا ہوں، پیسے چاہئیں۔“

ماں کچھ دیر تک سوچتی ہے پھر اپنے شوہر کی جیب سے روپے نکال کر بیٹے کو دیتے ہوئے کہتی ہے ”او کے۔۔۔ یہ لو پاس سو روپے آپ کا خرچہ!“

بیٹا (ہنستے ہوئے) مما جی آپ نے آج پھر ڈیڈ کی جیب کاٹ لی۔۔۔ ہاہاہاہا!

ماں طنزیہ لہجے میں کہتی ہے ”او بچے! تیرا باپ بھی کون سا پہاڑ کھود کر پیسے لاتا ہے، وہ دوسروں کی جیب کاٹ کاٹ کر لاتا ہے اور ہم مل کر اس کی جیب کاٹ دیتے ہیں۔

(دونوں ماں بیٹے کا جاندار قہقہہ گونجتا ہے، بیٹا ہنستے ہوئے روپے لے کر چل پڑتا ہے)

دوسرا منظر ہائی وے پر ناکہ بندی ہے۔ کچھ پولس اہلکار کھڑے ہوئے ہیں، اتنے میں ایک بائیک سوار ہیلمٹ پہنے آتا ہے۔ حولدار ہاتھ دے کر روکتا ہے۔ ”ابے او نواب زادے، رُک۔۔۔ رُک!!“

لڑکا: (ہیلمٹ کو جھٹکے سے اتارتے ہوئے) او مسٹر، زبان سنبھال کر بات کیجئے۔ آپ جانتے نہیں میں کون ہوں؟

حولدار: چل آ جا بیٹا ہمیں تمیز سکھا رہا۔۔۔ نہ ہم جانتے ہیں کہ تو ہے کون اور نہ ہی جاننا چاہتے ہیں۔۔۔ ابھی تیری ساری کنڈلی نکالتے ہیں۔

لڑکا: (موبائل فون نکال کر کال کرتا ہے) ہیلو، ہیلو ڈیڈ۔۔۔ میں یہاں ہائی وے پر ہوں اور یہ حولدار مجھ سے بدتمیزی کر رہا ہے۔

(لڑکا کچھ سن کر موبائل حولدار کی جانب بڑھاتا ہے)

حولدار: جی کون؟ آپ۔۔۔ اووووہ ارے سر آپ، سلام سر (سلیوٹ بھی جھاڑ دیتا ہے)۔۔۔ جی سر ہمیں نہیں پتہ تھا کہ یہ چھوٹے صاحب ہیں۔ جی صاحب اور کوئی خدمت۔۔۔ جی جی صاحب۔۔۔

لڑکا: (موبائل فون واپس لے کر حقارت سے حولدار کو دیکھتا ہے اور کہتا ہے) کیوں بے بابا بنگالی۔۔۔ نکال لی کنڈلی؟

حولدار: (سہم کر) ارے چھوٹے صاحب غلطی ہوگئی، اب

معاف بھی کردو۔

لڑکا: (منہ سے سگریٹ لگاتے ہوئے جلاتا ہے اور ایک لمبا کش لے کر کہتا ہے) ابے سن، ٹکروں پر پلنے والے کتے بھونکتے نہیں سمجھے!! یاد رکھیو کہ ہم کون ہیں۔

تیسرا منظر

انسپکٹر کا سجا سجایا بڑا سا بنگلہ۔ سٹنگ روم کا منظر، نہایت قیمتی فرنیچر۔

انسپکٹر: (دور سے آواز آتی ہے) بیگم، او جی بیگم!

بیگم: جی جی آئی۔

سنو: یہ ہماری جیب سے پیسے کس نے نکالے، کتنی بار منع کیا ہے تمہیں پیسے نہ نکالا کرو۔

بیگم: (گھورتے ہوئے) او مسٹر، یہ رعب اور دبدبہ اپنے تھانے میں دکھانا۔۔۔ میں نہ کوئی حولدار نہیں ہوں، نہ کوئی چور اُچکی۔۔۔ بھولو مت کہ یہ وردی اور دولت شہرت سب میرے وزیر باپ نے تمہیں دان میں دی ہوئی۔ ورنہ تو تم حولداری کے لائق نہ تھے۔

وہ انسپکٹر جسے اچھے اچھے سلام کرتے تھے۔ اپنی ہوم منسٹر کے سامنے نظر جھکائے کھڑا تھا۔

چوتھا منظر

وزیر صاحب اپنے آفس میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ دروازے پر دستک ہوتی ہے۔

انسپکٹر: مے آئی کم ان سر؟

وزیر صاحب: (لہجہ تلخ و طنز آمیز) یس یس کم ان ''انسپکٹر صاحب۔'' (انسپکٹر صاحب پر زور دیتے ہوئے)

انسپکٹر: (شرمندہ سا چہرہ لئے داخل ہوتا ہے اور کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

وزیر صاحب: (تیز لہجے میں) ابے او لومڑ۔۔۔ اُٹھ کھڑے ہو۔۔۔ اور سن، ہم نے تجھے نوکری دلائی، تجھے اتنی ترقی دی، حتیٰ کہ تجھے داماد بھی بنا لیا اور تجھ سے ایک ذرا سا کام نہیں ہوتا۔۔۔ ہمیشہ نکمے ناکارہ ہی رہنا۔

انسپکٹر: (سر جھکائے دھیمے لہجے میں) سر ہم تلاش کر رہے ہیں۔ آج نہیں تو کل، وہ لونڈے ہاتھ آ جائیں گے۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہیکر ہیں۔ اُن کا کوئی کا خاص ٹھور ٹھکانا نہیں ہوتا۔

وزیر صاحب: (حقارت بھرے لہجے میں) ابے او وو ولومڑ کی اولاد۔۔۔ یہ ہیکر و یکر تم جانو۔ ہمیں بس اپنا وہ سارا روپیہ چاہئے جو اکاؤنٹ سے اڑایا گیا ہے۔۔۔۔ جاؤ اب دفع ہو جاؤ اور جب تک وہ لونڈے مل نہیں جاتے، اپنی منحوس شکل نہ دکھانا مجھے!

(انسپکٹر وزیر صاحب کو سیلوٹ کر کے آفس سے نکل جاتا ہے اور دانت پیستے ہوئے سوچتا ہے۔۔۔ اچھا ہوا سالا بڈھا لٹ گیا۔۔۔ سارا مال تو حرام کا ہی کماتا ہے۔ ساری عوام کی لوٹی دولت پر موج کرتا ہے اور خود لٹ گیا تو سر پیٹ رہا ہے۔۔۔ خود لومڑ ہے اور کہہ مجھے رہا ہے۔

پردہ گرتا ہے۔

اور راقم الحروف امید لگائے ہوئے کہ کہ اس گرتے پردے کے ساتھ شاید ہماری قوم کے ذہن و دل پر پڑے پردے اُٹھ جائیں گے۔ اللہ حافظ و ناصر اس قوم کا۔

اس دنیا کا پہلا جرم ایک عاشق نے اپنے بھائی کا قتل کر کے کیا۔ یوں عشق اور جرم جڑواں بھائی ہیں۔ اس دنیا میں آدھے جھوٹ ناکام عاشقوں اور کامیاب عاشقوں یعنی خاوندوں نے بولے ہیں۔

عاشق وہ واحد فرد ہے جو محبوب کی ترقی نہیں چاہتا کہ کہیں یہ اس کی پہنچ سے دور نہ ہو جائے۔ ایک دوست عاشق بن سکتا ہے لیکن جو ایک بار عاشق بن جائے وہ پھر کبھی دوست نہیں بن سکتا۔

ڈاکٹر یونس بٹ

محمد سالک جوہر صاحب کا تعلق ہندوستان کے صوبہ مہاراشٹر کے ایک شہر مالیگاؤں سے ہے۔ بسلسلۂ روزگار جدہ (سعودی عرب) میں مقیم ہیں۔ اُردو زبان و ادب سے از حد محبت بلکہ عشق ہے اور اس کی چاشنی کے شیدائی ہیں۔ فیس بک سے لکھنے کا آغاز کیا ہے۔ طنز و مزاح کے منہ زور گھوڑے کی سواری پسند ہے کہ اس سے ہنسی ہنسی میں خاصی کام کی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' میں یہ ان کی اوّلین تحریر ہے۔

حافظ مظفر محسنؔ

دھوکے باز پھل

واہ۔۔۔میاں نمونہ
اندر مٹی باہر چونا

جب پہلی بار انسان کا تربوز کے پاس سے گزر ہوا ہوگا تو اس نے خوف کے مارے ۔۔۔ تر۔۔۔ تا تا۔۔۔ تا تا۔۔۔تر ۔۔۔بوز کہہ ڈالا ہوگا یعنی اس تربوز کو بڑے بلکہ بہت بڑے سائز کی ''تر'' سمجھ لیا ہوگا مگر جب اس نے اس دھوکے باز پھل کو کھول کر دیکھا ہوگا۔۔۔ انگلیاں آپس میں میٹھے سے چپک جانے کے بعد چائی ہوں گی۔۔۔تو وہ پھر تر تر۔۔۔ تا تا۔۔۔ تر تر۔۔۔ بوز کہہ کر اچھل پڑا ہوگا۔

گاڑھا سبز اور اندر سے لال سرخ۔۔۔ کیا کہنے اس ذائقے دار ۔۔۔ جو سو فیصد پانی ہے۔۔۔آپ چبانے کی کوشش کریں وہ منہ میں بکھر کر اِدھر اُدھر چلا جائے گا اور بالکل قابو میں نہیں آئے گا۔آپ نے آج کل ٹی وی چینلز پر کئی بڑے بڑے ''ہدوانے'' بھی آپس میں الجھتے ہوئے دیکھے ہوں گے، وہ بھی ایک دوسرے کے ہاتھ نہیں آتے، اِدھر اُدھر نکل جاتے ہیں۔آپ کو یقیناً پتہ ہوگا کہ پنجابی میں تربوز کو ''ہدوانہ'' کہتے ہیں۔پچھلے دنوں سعد رفیق بے چارے کی بھی خان صاحب کے ہاتھوں خوب شامت آئی رہی۔۔۔خان صاحب کی دیکھا دیکھی اب گھروں میں ٹی وی دیکھتے بچوں کی خوب حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔وہ بھی آپس میں اِنہی لائنوں پر لڑتے ہیں، الجھتے ہیں اور بور نہیں ہوتے، بُرا نہیں مناتے، انجوائے کرتے ہیں ''اوئے'' کہنے پر شرمندہ نہیں ہوتے ''اوئے'' کہلا کر بھی شرمندہ نہیں ہوتے۔۔۔ ''دِس اِز پارٹ آف دی گیم۔۔۔ بوائے!'' آج کل کے انسانوں کی طرح تربوز مزید چکر بازی بھی جب چاہے کر جاتا ہے۔آپ بڑے اعتماد کے ساتھ دس بارہ یا پندرہ بیس کلو کا تربوز خریدیں۔۔۔اتنا وزن دار تربوز محبت میں اٹھائیں، شدید گرمی

میں اسے کھا جانے کے تصور سے خوش ہوں۔۔۔ہونٹوں پہ زبان پھیریں اور گھر جا کے بڑے اہتمام کے ساتھ کاٹیں۔۔۔جیسے اچانک لائٹ بند ہو جانے پر غیر ارادی طور پر بچوں کے منہ سے نکلتا ہے ''ہاؤ'' ایسے ہی کچا اور اندر سے لال کی بجائے سفید تربوز دیکھ کے سب کے منہ سے نکلتا ہے۔۔۔''جاؤ'' یعنی اپنا اپنا جاؤ۔۔۔کام کرو۔۔۔یہ تو تربوز کی بجائے ''کدو'' نکل آیا ہے لیکن اس پندرہ بیس کلو کے کدو کو آپ بطور سالن پکا نہیں سکتے۔ڈاکٹر مومن لطیف کہتے ہیں کہ ہم دیر تک اپنے بچپن میں تربوز کو ہاتھی کا انڈہ سمجھتے رہے اور حیرت زدہ ہوتے رہے۔

ان انسانی رشتوں کی طرح جو سیدھے چلتے چلتے اچانک راستہ بدل لیتے ہیں، منہ بھی موڑ لیتے ہیں، سارے بندھن توڑ لیتے ہیں اور پھر پہچانتے بھی نہیں۔غلطی کر کے اپنی غلطی مانتے بھی نہیں۔مجھے افسوس ہے کہ مرزا غالب نے اس دھوکہ باز پھل کی شان میں ایک بھی شعر نہیں لکھا۔شعر تو ویسے انہوں نے پسندیدہ پھل آم کے لئے بھی شاید نہیں لکھا، جس کے مرزا غالب عاشق تھے۔مرزا غالب کے بعد دیر تک آم بھی اُداس پھرتا رہا۔۔۔ایسا قدر دان کہاں؟

آج دوبئی سے خالد بھٹہ صاحب آئے تھے۔اُن کے سامنے بھی تربوز اور آم کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی، بولے ''یارو، تربوز سے یاد آیا۔۔۔ایک دفعہ آپ نے چائنہ سے گنجے پن کے علاج کے لیے لوشن منگوایا تھا، جس کے ساتھ ہدایات جاری کرتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا کہ یہ لوشن انگلی سے سر پر مت لگائیں ورنہ انگلی پر بھی بال اُگ آئیں گے۔۔۔ایسے ہی ہماری دوبئی والی بھابھی صاحبہ بھی سارا دن اے۔سی چلا کے سوئی رہتی ہیں، بھابھی بھیاء اور ان کی اکلوتی اولاد یعنی ایک گیارہ سال کا بچہ، موٹاپے نے زندگی برباد کر دی ہے کوئی دوا نہیں ایجاد ہوئی۔۔۔ایک مرغا (روسٹ) منگواتے ہیں۔مرغا بھی ڈیلیل ہوتا اور کھانے والے بھی۔۔۔اس قدر آرام دہ زندگی، ''پھول کر کپا ہو گئے ہیں۔سبز

جمہوریت کے اونچے ہلارے

رنگ کے کپڑے پہن لیں تو مت پوچھیے!‘‘

میں سمجھ گیا۔۔۔بات پھلوں کی ہو رہی تھی کہاں آم اور کہاں بے چارہ تربوز۔۔۔کہاں دوبئی میں رہنے والی نہایت خوشحال زندگی گزارنے والی بہت بڑی بڑی عورتیں اور کہاں ہمارے ہاں کی بیویاں۔۔۔دن بھر محنت۔۔۔خاوند بچوں کی خوب خدمت لیکن خاوند کی جھاڑیں جھڑکیاں اور ضدی پن۔۔۔مگر جدید تعلیم کے حصول نے موبائل فون کی آمد، انٹرنیٹ کی طاقت سے یہاں بھی نقشہ بدل کر رکھ دیا ہے۔ آپ بازار میں جائیں، اپنے شوہروں کے لیے خواتین خریداری کرتی دکھائی دیں گی۔ گاڑیاں چلاتی عورتیں اب شہروں میں آپ کو عام ملیں گی بلکہ جگہ جگہ ٹکرائیں گی۔

اچھی تبدیلی ہے۔۔۔بہر حال ابھی مزید تبدیلی کی گنجائش ہے۔’’عورت راج‘‘ کی طرف خاصی تندی سے چلتا جا رہا ہے ہمارا معاشرہ۔۔۔مرد اگر اسی طرح تھوڑی دیر مزید سوئے رہے تو پانی سر سے گزر جائے گا۔ ویسے جہاں جہاں پانی سروں سے گزر چکا ہے وہاں کی صورتحال میں نے اپنی اس نظم میں بیان کی ہے۔۔۔آپ بھی ملاحظہ کریں اور خود کو کسی جگہ فٹ کرنے کی کوشش کریں مزہ آجائے گا۔

دو دھاری تلوار سمجھ کر بیوی کو
پھولوں کی مہکار سمجھ کر بیوی کو
سونے جیسا منڈا اپنا دے ڈالا
شہر کا بڑا سونار سمجھ کر بیوی کو
ایسے لوگ سنبھال سنبھال کے رکھتے ہیں
ڈالر پاؤنڈ دینار سمجھ کر بیوی کو
جھکا رہا بیوی کے آگے جھکا رہا
ہائے ’’قطب مینار‘‘ سمجھ کر بیوی کو
حکم بجا لانے میں ہر دم جلدی کی
ماسٹر کانٹے دار سمجھ کر بیوی کو
بات بات پر وہ ڈانٹے اور ہم چپ
حاکم، زمیندار سمجھ کر بیوی کو
در پردہ ہے نئی کہانی بھی سن لو
سب رکھتے ہیں ہار سمجھ کر بیوی کو
کچھ کی ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں محسنؔ
ایک سو چار بخار سمجھ کر بیوی کو

بات چلی تھی تربوز سے آموں سے اور پہنچ گئی بیوی کے کڑوے رویے تک۔۔۔تلخ باتوں تک۔۔۔لیکن سچ کو ہم چھپا نہیں سکتے۔ گرمیوں میں تربوز بھی کھانا ہے اور آموں سے بھی لطف اندوز ہونا ہے۔ بدلتے زمانے میں اب یہ نہیں ہو سکتا کہ زندگی کی گاڑی کے دو پہیے مختلف سائز کے ہوں۔ ایک ٹرک کا پہیہ دوسری طرف بے بی سائیکل کا پہیہ۔۔۔اب تو ایک ہی سائز کے پہیے ہوں تو گاڑی چلے گی کیونکہ اب گاڑی گاؤں کی پگڈنڈی پر نہیں لاہور کی مال روڈ پر چلتی ہے۔ بیوی بھی جدید دور کے ٹی۔وی چینل دیکھتی ہے اور خاوند بھی (ذرا زیادہ غور سے دیکھتا ہے۔)

ایک ۸۵ سالہ شخص نے اپنے ایک دوست کو شادی کی ۶۰ ویں سالگرہ پر بلایا۔ وہ بار بار بیوی کو کچن سے ’’جان‘‘ یا ’’ڈارلنگ‘‘ کہہ کر بلاتا اور کچھ نہ کچھ منگواتا۔ دوست اس محبت بھری ادا سے بہت متاثر ہوا اور کہے بغیر نہ رہ سکا، بولا ’’دوست! بڑی حیرت کی بات ہے، شادی کو ساٹھ سال گزرنے کے باوجود تم اپنی بیوی کو اتنے محبت بھرے ناموں سے بلاتے ہو!‘‘

شوہر نے رازدارانہ انداز میں جواب دیا ’’یار! کیا بتاؤں، دس سال ہوئے، میں بیوی کا نام بھول چکا ہوں؟‘‘

حافظ مظفر محسنؔ کا تعلق لاہور سے ہے۔ بچپن سے لکھ رہے ہیں۔ بچوں کے ادب کے سلسلے میں اِن کی خدمات گراں قدر ہیں۔ طنز و مزاح اِن کا اوڑھنا بچھونا ہے۔’’طنز و مزاح‘‘ کے عنوان سے ایک اخبار میں کالم بھی لکھتے ہیں۔ طنز و مزاح پر مبنی اِن کی کئی کتب شائع ہو چکی ہیں۔ شاعری بھی کرتے ہیں، ایک عدد شاعری کی کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔ لاہور کے ادبی محافل میں خاصے متحرک ہیں۔ برقی مجلّے ’’ارمغانِ ابتسام‘‘ کے لئے اِن کی محبت ہمارے لئے سرمایۂ افتخار ہے۔

عائشہ تنویر

شرارتِ شین

ہماری تحریر کے عنوان سے آپ یہ مت سمجھ لیجیے گا کہ ہم پاکستانی اداکارہ ''شین'' کی بات کر رہے ہیں۔

ہم تو بات کر رہے ہیں اُردو حروف تہجی والے ''ش'' کی، جو شوہر، شاعر، شاپنگ، شادی جیسے بے شمار الفاظ کے شروع میں آتا ہے۔

''ش'' سے شروع ہونے والے الفاظ بظاہر بہت شریف، شفیق اور شائستہ شمار کیے جاتے ہیں لیکن ان میں موجود ''شر'' کے شر بار شراروں سے وہی لوگ واقف ہوتے ہیں، جن پر گزرتی ہے۔

اب شادی کو ہی لے لیجیے، کسی کے لئے شادمانی تو کسی کے لئے بے امانی۔۔۔ یہ وہ شوارما ہے جو کھالے وہ بھی پچھتائے اور جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے۔ (لڈو آج کل کھاتا کون ہے)

جن کی شادی نہیں ہو پاتی وہ شرمندہ شرمندہ پھرتے ہیں کہ کوئی یہ نہ کہہ دے ''تمہیں کوئی پوچھتا نہیں'' اور جن کی ہو جاتی ہے وہ بھی منہ چھپائے پھرتے ہیں کہ اب پوچھے جانے کے لائق نہیں رہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ شادی شدہ خواتین و حضرات کسی لائق ہی نہیں رہتے۔

''ش'' شوہر حضرات کا ہی ذکر کر لیں، ان کی شرافت کے شہرے آپ نے بہت سنے ہوں گے لیکن یہ سب صرف شہرے ہی ہیں ورنہ ان کی شعلہ بیانیوں سے کون واقف نہیں۔ شوخی و شرارت سے ہلکی پھلکی رومانوی گفتگو کرتے کرتے کب ان کے مزاج کا رنگ بدل جائے، پتہ ہی نہیں چلتا۔ بس ادھر ان کا لہجہ بدلتا ہے اور ادھر سولہویں صدی کی ہیروئن بنی، شرم و حیا سے گلابی ہوتی شریک حیات بھی شیشے کی طرح تڑختی ہیں۔

لیکن شریک حیات چاہے شعلہ مزاج ہو یا شبنم۔۔۔ دل و گھر کا سکون تو اسی سے وابستہ ہے۔

''ش'' شاپنگ تو لازمی جز ہے زندگی کا۔۔۔ یہی شاپنگ اگر شاہانہ ہو جائے تو قارون کا خزانہ بھی کم ہے۔

شاپنگ کر کے جہاں بیوی شاداب، کھلا گلاب ہو جاتی ہے، دل خوشی سے بھر جاتا ہے تو شوہر حضرات کے تاثرات جیب خالی ہونے پر الم ناک ہو جاتے ہیں۔

بیویاں بھی جانتی ہیں کہ جیسے خواتین کو ''شو مارنے''

(دکھلاوے) کا شوق ہوتا ہے، اُسی طرح شوہر حضرات غربت کا شور ڈالنے کے عادی، تب ہی وہ کوئی اثر نہیں لیتیں۔

''شاعری سچ بولتی ہے'' تو زبان زدِعام جملہ ہے لیکن شاعری چاہے سچ بولے بیشتر شاعر حضرات تو جھوٹ ہی بولتے ہیں۔

ان کے خوابوں کی شہزادی اس زمین پر ہمیں تو نظر نہیں آئی لیکن اس ''غیر موجود شہزادی'' کی وجہ سے موجود حسیناؤں کی قدر میں کمی ضرور آ گئی۔

شاعر اور عاشق شاعری سنا کر داد اور دیدار پاتے ہیں تو یہی شاعری سن کر شوہر حضرات آہیں بھرتے ہیں۔

ہائے۔۔۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت۔

کسی بھی شاعر کا دیوان اٹھا لیں، جو جتنا شریف، شرمیلا ہو، شاعری میں اس سے دوگنا شراب و شباب کا تذکرہ کرے گا۔ حقیقت میں پیا کبھی سگریٹ بھی نہ ہوگا اور شادی اماں کی پسند سے ہوئی ہوگی، وہ بھی اگر قسمت میں ہو تو، سو جناب ظاہری شناخت پر نہ جائیں، شکر کرنا سیکھیں۔

ہر ''شخص'' میں خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی۔۔۔ سو ہر ایک کی خوبی ڈھونڈیں، خامی بھول لیں اور خوش رہیں۔

عائشہ تنویر صاحبہ کا تعلق کراچی سے ہے۔ محترمہ نے ریاضی میں ایم ایس سی کیا ہوا ہے۔ میدان ادب میں نووارد ہیں لیکن اندازِ بیان کی پختگی اور لب و لہجے کی چلبلاہٹ اور بیساختگی سے اُن کے فکاہی معیار کا پتہ چلتا ہے۔ طنز و مزاح، بچوں کی کہانیاں اور سماجی و معاشرتی موضوعات کو تختۂ مشق بنایا ہے۔ مختلف خواتین کے جرائد کے لیے لکھتی ہیں۔ ''ارمغان ابتسام'' کے لیے یہ ان کی دوسری تحریر ہے۔

پاکستان کا جمہوری سرکس اور سیاستدان

کے ایم خالد

جدید درخواستیں

جناب وزیر اعظم صاحب

عنوان: درخواست برائے اجازت سیاسی ہلہ گلہ۔

جناب عالی!

گزارش ہے کہ فدوی کو آپ جناب اور آپ کی پارلیمنٹ نے مملکت خداداد پاکستان کا صدر منتخب کیا ہوا ہے ۔ چونکہ شہر اقتدار میں ان دنوں خزاں کا موسم ہے اور ہر جانب پیلاہٹ ہی پیلاہٹ نظر آتی ہے جو کہ آنکھوں کو بھلی محسوس نہیں ہوتی ۔ آپ کے آجانے سے دل ذرا بہل جاتا ہے ورنہ تو اتنے بڑے ایوان صدر میں پاکستان کے صدور کی تاریخ کو یاد کرتے ہوئے دن اور رات گزرتی ہے۔ جناب زرداری کے صدارت کے نشان ایوان صدر میں جابجا نظر آتے ہیں ۔صدر ہوتے ہوئے بھی وہ کس قدر سیاسی تھے کہ انہوں نے اپنی پارٹی کا پانچ سالہ دور بچوں جیسی معصومیت کے ساتھ گزار دیا۔عدالت نے ایک وزیر اعظم کی قربانی لی تو انہوں نے فوراً قربانی کے لئے دوسرا پیش کر دیا لیکن ان کے پارٹی کے لوگوں کی وفاداری پر بھی رشک آتا ہے کہ انہوں نے اپنے صدر کے استثنٰی پر حرف نہیں آنے دیا جی تو میرا بھی بہت چاہتا ہے کہ میرا بھی کوئی استثنٰی اس قدر مقبول ہو جائے کہ چہار عالم اس کی دھوم ہو لیکن یہ سوچ کر چپ ہو جاتا ہوں کہ کونسا استثنٰی ۔ان کا بیان میڈیا میں سنا اور پڑھا کہ ہم نے صدر کا عہدہ غیر سیاسی کر دیا ہے تو بے اختیار تارڑ صاحب یاد آگئے ۔ وہ خود تو ''میں ابھی آیا'' کا کہہ کر مجھے شائد بھول گئے ہیں اور میں یہاں بطور صدر بور ہو رہا ہوں ۔اس سے قبل کے شہر اقتدار کے گلی کوچوں میں کوئی وال چاکنگ کروا جائے کہ ''چوہدری ظہور الٰہی کو رہا کرو'' صدر صاحب کو بھی بے ضرر سے سیاسی ہلے گلے کی اجازت دی جائے تا کہ کہ فدوی کا دل بہل سکے ۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ فدوی کو بائیو۔۔لوجی سے کس قدر شغف تھا اسی لئے فدوی آج کل سابق صدر غلام اسحاق اور فاروق لغاری صاحبان کی آٹو بائیوگرافی کو دل جمعی سے پڑھ رہا ہے۔

فدوی آپ کا مشکور و ممنون رہے گا۔

العارض

آپ کا اپنا حالیہ صدر۔

جنابِ وزیرِ خزانہ

وہ فاقہ ای حکومت پاکستان

عنوان: **درخواست برائے ردِ بجٹ۔**

جنابِ عالی!

گزارش ہے کہ ہر حکومت کو بجٹ دستاویزات کی تیاری کے لئے کروڑوں روپے خرچ کرنا پڑتے ہیں۔ ''اقتصادی ماہرین'' کی فوج ہے جو عوام کی حالت بدلنے اور حکومت کو اس میدان میں کامیاب کروانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ اس تمام تر تیاری کے باوجود اپوزیشن کا پہلا جملہ یہی ہوتا ہے ''مزہ نہیں آیا'' کچھ اپنے آپ پر ہی مشتمل پارٹیاں کچھ زیادہ ہی کھپ مچانے کی کوشش کرتے ہیں تو سپیکر کو مجبوراً ان کے مائیک کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے جنہیں متاثرہ فریق نادیدہ قوت کا ہاتھ قرار دیتے ہیں۔

جناب۔۔۔ایک دور تھا جب پاکستان کے بجٹ کو عوام ایک آئیڈیل بجٹ قرار دیتے تھے ٹیکس پروگرام کا ''خونی کھیل'' سال میں ایک مرتبہ ہی کھیلا جاتا تھا پٹرول، بجلی، گیس اشیائے خورد نوش کی قیمت بجٹ کے موقع پر ہی بڑھانے کی اجازت ہوتی تھی سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں تو پانچ فیصد اضافہ کر دیا جاتا لیکن کسی وزیر خزانہ نے مزدور کی مزدوری کی بات نہیں کی تھی اور مزدور کو مارکیٹ کے ''کھتریوں'' کے حوالے کر دیا جاتا تھا لیکن اس وقت کے مزدور کی گزراوقات سرکاری ملازم سے بہتر تھی۔

تقریباً تمام سیاسی پارٹیوں کے منشور میں مزدور کی ''تعریف'' کی گئی ہے اور اسی کو بنیاد بنا کر سیاسی پارٹیاں اپنا پنڈال گرم کرتی ہیں۔ سب کا دعویٰ ہے کہ اگر ان کی پارٹی اقتدار میں آ گئی تو وہ مزدور کی قسمت بدل دے گی۔ مگر جب مزدور اپنی مزدوری جو کہ حکومت وقت نے مقرر کی ہے وصول کرتا ہے تو وہ مزدوری کسی کریانہ فروش کے ہاتھوں میں پگھل کر نیچے گر جاتی ہے اسکے باپ
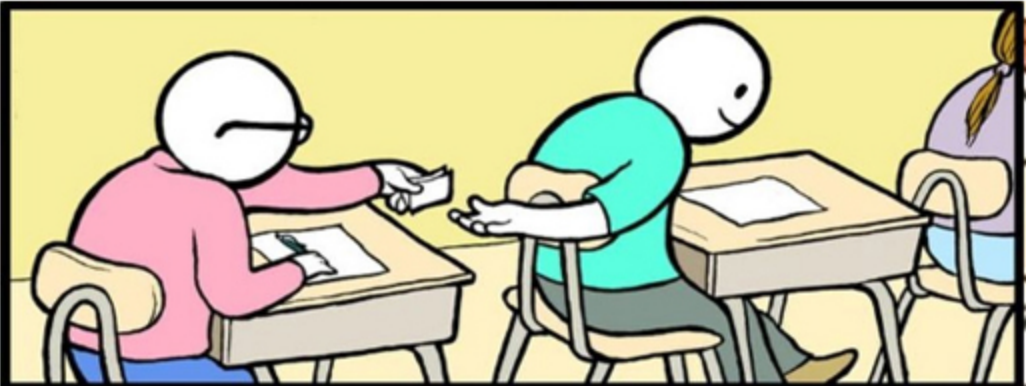
کی کھانسی، ماں کی شوگر، بیوی کے پیوند لگے کپڑے اور منے کے ننھے پیروں کی چپل کے لئے وہ اپنی قوت بازو اور قسمت پر شاکر ہے۔

اب جبکہ روز ہی بجٹ سنایا جا رہا تو پھر ہر سال بجٹ کی کیا ضرورت ہے کیوں جون کی گرمی میں بجٹ کا رولا ڈالا جاتا ہے کیا اس بجٹ سے عوام کی حالت میں کوئی فرق پڑا ہے "ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات" یہ مزدور کی اوقات تلخ ہی رہنی چاہئے اگر یہ ایک تولہ سونے کے برابر ہو گئے تو پھر آوے آوے، جاوے، جاوے کون کرے گا، کون جون میں مارچ کرے گا، کون جون کی تپتی دوپہروں اور دسمبر کی کڑکتی سردیوں میں پنڈال بھرے گا، کون دھرنے دے گا۔

گاما بی اے، بھٹہ مزدور
خوشحال پورہ، دھوکہ منڈی

جناب تھانہ انچارج صاحب

عنوان : **درخواست برائے درج کئے جانے ایف آئی آر برائے چوری شدہ شاعری۔**

گزارش ہے کہ فدوی آپ کے تھانے کی حدود میں ایک مضافاتی علاقے موضع ہوشیار سے تعلق رکھتا ہے۔ اس علاقہ کی زمین شاعری کے لئے بہت زرخیز ہے اور یہاں روز بروز نئے شاعر پیدا ہو رہے ہیں۔ فدوی اس علاقے کا ایک مشہور شاعر ہے جس کا کلام علاقے کے بھانڈوں اور بینڈ باجے والوں میں بہت مشہور ہے فیس بک پر فدوی ہوشیار بھائی کے نام سے مشہور ہے۔ فیس بک پر بھائی کے کلام پر لائک کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ بھائی کا کلام تقریباً پانچ سوصفحات تک جا پہنچا تھا۔ جسے کسی شاعری دشمن نے رات کے اندھیرے میں چرا لیا اب وہ ناہنجار میرے کلام کو اپنے نام کے ساتھ فیس بک پر روزانہ اپ لوڈ کرتا ہے۔ اس کا یہ فعل میری بدنامی کا باعث بن رہا ہے اور علاقہ کے لوگ جو میری شاعری کے معترف تھے مجھے چربہ اور سرقہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ آپ کے حضور فدوی اس بات کا اظہار کرتے کوئی شرمندگی محسوس نہیں کرتا کہ بھائی نے تک بندی سے کلام موزوں تک کا سفر کیسے طے کیا۔ علم عروض تو وہ بھول بھلیاں ہیں کہ شائد ہی کوئی شاعر اس دشت کی مکمل سیاحی کر سکے۔ فدوی کو چند قابل بھروسہ لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ آپ جناب بھی شاعری سے شغف رکھتے اور زخمی تخلص فرماتے ہیں لیکن آپ کو جو کلام میرے ہاتھ لگا ہے وہ کلام موزوں نہیں ہے اور علم عروض پر پورا نہیں اترتا۔ میں آپ جناب کے کلام کو موزوں کر سکتا ہوں بلکہ آپ سے کیا پردہ ایک ویب سائٹ بھائی کے ہاتھ لگی ہے جو کہ آپ کے کلام کو موزوں کرنے میں آپ کی معاون ثابت ہو سکتی ہے فدوی نے بھی وہیں سے استفادہ کیا ہے۔

جناب۔۔۔ گزارش ہے کہ پانچ سوصفحات پر میری ایک ہزار کے قریب شاعری کی مختلف اصناف درج ہیں میں نے آپ جناب کا ایک کام کیا ہے تو فدوی کی بھی شاعری کی چوری کی ایف آئی آر کاٹی جائے تاکہ بھائی اسے فیس بک پر مشتہر کر کے اپنی روز بروز پھیلنے والی بدنامی کو روک سکے۔

العارض
ہوشیار بھائی شاعر، ہوشیار پور

کے ایم خالد صاحب راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ موصوف عرصہٗ دراز سے لکھ رہے ہیں۔ اب تک ہزاروں کی تعداد میں مضامین، کالم اور ڈرامے لکھ چکے ہیں۔ ٹی وی کے بہت سے چینلوں پر اِن کے ڈرامے پیش کئے جا رہے ہیں۔ اِن دِنوں "مزاح۔مت" کے عنوان سے ایک اخبار میں کالم بھی لکھ رہے ہیں۔ خالد صاحب کے اسلوبِ بیان اوّل تا آخر فکاہی ہے۔ اِن کے ہاں طنز کی بے مثال چاشنی پائی جاتی ہے۔ اِن کی مختصر کہانیاں خاصے کی چیز ہیں۔ "ارمغانِ ابتسام" کی مجلسِ مشاورت میں شامل ہیں اور یہاں کی رونقوں میں اِن کا بھی خاصا ہاتھ ہے۔

راشد حمزہ

کتّا نہیں لگتا

کمہار کے کتوں کے بارے میں سنا تھا کہ بہت بھونکنے والے ہوتے ہیں، ہر جان انجان شخص پر بھونکتے ہیں۔ کمہار اسے اس اپنی بھٹی کی حفاظت کے لئے رکھتا ہے جہاں وہ مٹی کے برتن پکاتے ہیں اور جو اکثر کمہار کے پڑوسیوں کے شریر بچوں کی بے مہار سنگ باری کے نشانے پر ہوتے ہیں۔

یہ کہانی جھوٹی سچی ہوسکتی ہے۔ کمہار کے کتوں میں خوبیاں یا خامیاں ہوسکتی ہیں لیکن جن کتوں کا میں ذکر کررہا ہوں وہ سراپا شر اور باعث نحوست ہیں۔ وہ بھونکتے تو اچھے سے ہیں لیکن اکثر ان کا بھونکنا اتنا بے جا، بے موقع اور منطق سے خالی ہوتا ہے کہ اپنے ہی مالک کو پھنسادیتے ہیں، یوں ہمیں مجبوراً ایسے کتوں پر لعنت بھیجنا پڑتی ہے۔

خیر، یہ تین دن پہلے کا ذکر ہے جب ہماری محبوب شخصیت کے ایک جائز کام پر پورے میڈیا اور کمہار کے کتوں نے ہنگامہ برپا کیا ہوا تھا، اس لئے ہم نے بھی سوچا کہ کیوں نہ ان کمہار کے کتوں کو ان کی زبان میں دندان شکن جواب دینے کیلئے کمہار کے کتوں کی ہی خدمات حاصل کی جائیں۔ ہم نے اس خواہش کو گھر تک پہنچانے کی سوچی اور ازراہِ مذاق اپنی اس خواہش کا اظہار اسی فیس بک اکاؤنٹ سے ایک پوسٹ کے ذریعے اِن الفاظ میں کردیا:

''ہمیں دوعدد کمہار کے کتے چاہئیں۔''

ہماری اس پوسٹ کے اپڈیٹ ہونے کے چند منٹ بعد ہمارے ایک دوست انباکس آئے اور ہمارا ایڈریس معلوم کیا۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید وہ مجھے کوئی گفٹ کرنا چاہ رہے ہیں اور گفٹ میں حسبِ معمول کوئی نادر کتاب دینا چاہتے ہوں اور اس بار گھر آ کر دینا چاہتے ہیں۔ ایک ثانوی خیال ذہن میں یہ بھی آیا کہ شاید وہ مجھے شرفِ میزبانی بخشنا چاہتے ہیں۔ ہم نے انھی خیالات کے رو میں بہہ کر اُسے اپنا ایڈریس دے دیا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ میں اپنے ڈیرے میں جنوری کی نرم گین دھوپ میں بیٹھا کچھ لکھنے میں مصروف تھا کہ پتہ پوچھنے والے دوست کی کال آگئی۔ سلام دعا کے بعد اس نے خوشخبری دی کہ میں آپ کے دیئے ہوئے پتہ پر میں پہنچ چکا ہوں۔ میں ان کے استقبال کے لئے سڑک تک گیا۔ اُن کی گاڑی آکر رکی وہ اتر گئے تو کیا دیکھتا ہوں کہ اُنھوں نے اپنے ساتھ ساتھ گاڑی کی پچھلی سیٹ سے ایک سفید دھبے دار مگر کالا، صحت مند، اطاعت گزار، نقرئی آنکھوں والا اور ریشمی پلا نکالا۔ گاڑی سے باہر آنے کے بعد

بسوں اور لاریوں کی ٹکٹوں پر جلی حروف میں ''نا قابل انتقال'' لکھا نظر آتا ہے۔ ہمیں اس دعوے پر کوئی اعتراض نہیں۔ ارباب اختیار سے اتنی گزارش ضرور ہے کہ وہ صرف ٹکٹوں کے سلسلہ ہی میں ''نا قابل انتقال'' کا گارنٹی نہ دیں بلکہ اس فہرست میں بچارے مسافروں کو بھی شامل کرلیں جو سفر کے دوران ''نا قابل انتقال'' والی ٹکٹ جیب میں رکھنے کے باوجود آئے روز انتقال کر جاتے ہیں اور اس بہانے اگلے روز اپنی تصویریں اخباروں میں شائع کراتے ہیں۔

روزنِ دیوار سے از عطاء الحق قاسمی

پلے کی آنکھیں حیرت میں ایسی ڈوب گئیں کہ جیسے اس نے بالکل نئی اور مختلف دنیا میں جنم لیا ہو۔

خیر، میں نے گرمجوشی سے دوست کو خوش آمدید کہا اور اپنے ڈیرے تک رہنمائی کی۔ راستے میں، اِس خیال سے پلے کے بارے میں سوال پوچھنا مناسب نہیں سمجھا کہ بعض لوگوں کے ہاں کتے پالنا فیشن ہوتا ہے اور بعض کے ہاں مجبوری ہوتی ہے۔ خیر جب ہم اپنے ڈیرے پہنچ گئے تو میں نے از راہِ تجسس، پلے کے بارے میں سوال کر ہی ڈالا۔ محترم دوست نے بندہ حیران، خدا مہربان کے مصداق کہہ دیا کہ دراصل میں آپ کو یہ تحفہ اپنے ہی ہاتھوں سے دینا چاہتا تھا۔ میں نے نہایت انکساری کے ساتھ اتنے نایاب تحفے کے لئے شکریہ ادا کیا۔

چائے کا دَور شروع ہوا تو اس نے پلے کے بارے میں حیرت انگیز باتیں کہیں۔ اِس کی خصوصیات گنوائیں۔ پلے کے پسندیدہ مشاغل اور دلچسپیوں کے بارے میں تبادلۂ خیال ہوا۔ دوست نے اس کے حسب و نسب کے بارے میں بتایا کہ دراصل اس کے اجداد ایران سے تعلق رکھتے ہیں۔ ماضی میں ان کا خاندان پہلوی خاندان کی خدمات پر مامور رہ چکا ہے۔ اب بھی اس کا خاندان ایران میں ایلیٹ کلاس کی خدمات پر مامور ہے، اس کے دادا اور دادی کچھ عرصہ قبل ایک خانہ بدوش خاندان کے ساتھ ایران سے افغانستان اور افغانستان سے پختونخواہ آئی تھی۔

دوست نے مجھے پلے کی یہ خوبی بھی بتائی کہ اگرچہ ان کی مادری زبان فارسی ہے لیکن اِس نسل میں دوسری زبانیں سیکھنے کے حوالے سے بھی زبردست تجسس پایا جاتا ہے، اس لئے فکر مند ہونے کی کوئی بات نہیں، یہ پشتو آپ کے مقامی لہجے اور رنگ و آہنگ کے ساتھ جلد سیکھ جائے گا۔

ہمارے دوست رخصت ہوئے۔ ہم پلے کو اپنے کمرے لے آئے۔ ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ پلا ناشناسائی کی وجہ سے چپ چپ ہے یا تھکاوٹ کی وجہ سے دم سادھے ہوئے ہے۔ ایک بار تو یہ گمان بھی ہوا کہ شاید کسی فلسفے کی گتھی سلجھانے کے لئے اپنے من کی گہرائیوں میں ڈوب گیا ہے۔

بہرحال اس کے آنے سے گھر میں رونق سی لگ گئی ہے۔ پڑوسیوں کے بچوں کا تانتا بندھ گیا ہے۔ اُس کی ہم نشینی میں ایک پورا دن گزر گیا ہے مگر اس ایک دن (شب و روز) میں، میں نے اس مہمان پلے میں ایک بھی خصلت کتوں والی نوٹ نہیں کی بلکہ طبیعت اور خصلت سے تو یہ ہمارے سیاسی شریفوں سے بھی زیادہ شریف النفس اور طرح دار لگ رہا ہے۔ گمان بھی نہیں ہو رہا کہ اتنا تمیز دار پلا کتوں کی نسل میں سے ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کو پڑوسیوں کے بچوں کے ساتھ تمیز و اخلاق سے پیش آتے دیکھ کر مجھے کسی کتاب میں پڑھے ہوئے لکھنوی آداب یاد آ گئے ہیں۔

راشد حمزہ کا تعلق قدرتی جنگلات اور شفاف پانیوں کے چشموں، ندیوں اور خوبصورت وادیوں کی سرزمین سوات سے ہے تاہم سکونت لاہور میں اختیار کئے ہوئے ہیں۔ موصوف خطے کے سماجی اور سیاسی حالات و واقعات کے شاہد اور تبصرہ نگار ہیں۔ فیس بک پر خاصے متحرک ہیں۔ ان کے مضامین میں چلبلاہٹ اور شگفتگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

صرف اور صرف باتیں

نیاز محمد

میں جب اپنی کسی تحریر پہ احباب کے مکالمات دیکھتا ہوں تو دل کرتا ہے سب کا فرداً فرداً شکریہ ادا کروں۔ ایسے موقع پر میرے پسندیدہ الفاظ ممنونیت کے ہوتے ہیں لیکن میری کوشش ہوتی ہے کہ ممنون اور حسین اکٹھے نہ ہونے پائیں۔ شاید مجھے دونوں کا ملاپ پسند نہیں یا شاید احباب کو سمجھنے میں مسئلہ ہوتا ہے، اس لیے اپنے کلام کو حسین بنانے کے لیے مجھے ممنون کا ممنون ہونا پڑتا ہے۔

کبھی کبھی دل کرتا ہے احباب کی محبتوں کا ممنون نہیں شکر گزار ہو جاؤں کیونکہ ممنون کو اور بھی بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں۔ اُنہیں کہیں جانا بھی ہوتا ہے۔۔۔ ویسے آپ کو اندازہ نہ ہو لیکن مسلسل چپ رہنے سے بھی بندہ تھک جاتا ہے۔ اِس بات کا اندازہ شاید اساتذہ خوب کر سکیں اور خصوصاً وہ اساتذہ جن کے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہوتا اور ہر دو تین منٹ بعد بچوں پر رغب ڈالنے کے لیے "اوئے چپ" یا پھر "شور نہیں" کا ہنکارا لگاتے رہتے ہیں، لیکن بچے پھر بچے ہوتے ہیں، کب باز آتے ہیں باتیں کرنے سے۔

حیران ہوں کہ ایک طرف باتوں سے منع کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف ہم کلام نہ ہونے کو معیوب سمجھا جا رہا ہے۔ بعض لوگوں کی ایک عجیب عادت ہوتی ہے، وہ باتیں کرتے نہیں بلکہ باتیں بناتے ہیں۔ یہ اگرچہ اتنا آسان کام نہیں لیکن پھر بھی لوگ شوق سے کرتے ہیں۔ اس کے لیے کسی خام مال کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ جو باتیں بے بنیاد ہوتی ہیں، وہی سب سے پائیدار ثابت ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے بنیاد کے لیے ٹھوس اور مضبوط ہونا ضروری ہوتا ہے لیکن یہاں چونکہ بنیاد ہوتی ہی نہیں لہٰذا جب بھی کوئی خطرہ

محسوس ہو، سیاق وسباق بدل لو۔

ویسے باتیں کرنے اور بنانے سے چپ رہنا زیادہ بہتر ہے۔ کہتے ہیں دو بہنیں تھیں۔ دونوں کی زبان میں لکنت تھی اور بات کرتے وقت ''ٹرٹر'' کے الفاظ بولا کرتیں تھیں۔ یہ بات ان کے رشتوں میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ اِس لیے سوچ سمجھ کے بعد فیصلہ ہوا کہ اب کی بار رشتہ آیا تو دونوں چپ رہیں گی، منہ نہیں کھولیں گی۔ رشتہ آیا۔ دونوں نے کمال ضبط سے کام لیا لیکن آخری لحات میں اُن میں سے ایک بول پڑی۔ دوسری خوش ہو کے بولی ''خہ دا خوری چی تاٹری مانہ ٹری'' (اچھا ہوا بہن، میں نہیں بولی!)

بس نصیب کی بات ہے۔۔۔ بعض لوگوں کو سننے کے لیے کان ترس جاتے ہیں اور کسی کی باتیں سن سن کر کان پک جاتے ہیں۔ جہاں انسان کے بولنے کی ضرورت ہے، وہاں چپ کا روزہ رکھ لیتا ہے اور جب منع کرو بات کرنے سے تو آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے۔ یہ سرکشی اس کی فطرت ہے کہ جس کام سے منع کرو وہی کرتا ہے، بات کا بتنگڑ بھی بنا لیتا ہے اور چپ کا روزہ بھی رکھتا ہے، باتیں سنتا بھی ہے اور سناتا بھی ہے۔ بھنکتا بھی ہے اور اُس کے منہ سے پھول بھی جھڑتے ہیں۔

کان بھرنے کا معاملہ ہو تو صنف نازک بازی لے جاتی ہے اور مرد جلد ہی اس کی باتوں میں آجاتا ہے۔ باتیں کرنے میں عورتوں کا ثانی نہیں، دوسری طرف چپ رہنا اس کی بس کی بات نہیں۔

کچھ باتیں چونکہ راز کی ہوتی ہیں لٰہذا یہ بھی سنا ہے کہ عورتیں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں اس لیے راز نہیں رکھ پاتیں اور سب کچھ بول لیتی ہیں۔ سوچتا ہوں یہ سچ نہ ہی ہو تو بہتر ہے۔ ویسے آپس کی بات ہے، آپ مانتے ہیں کہ عورت چپ نہیں رہ سکتی۔۔۔ دعا کریں کہ عورت چپ ہی رہے ورنہ ہم آپ کو ممنون حسین کی یاد بہت ستائے گی۔

نیاز محمود صاحب کا تعلق ''چھوٹا لاہور'' صوابی سے ہے۔ ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ سے ایم۔ فل کیا ہے، مقالے کا عنوان تھا ''قدرت اللہ شہاب کی نثر کے فنی محاسن''۔ ناردرن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی جاری ہے۔ درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ انشائیہ اور افسانہ نگاری میں خصوصی دلچسپی ہے۔ طنز و مزاح سے بھی رغبت ہے جو اُنہیں ''ارمغانِ ابتسام'' کی طرف لے آئی ہے۔

شوہر آشوب
(میر تقی میر سے معذرت کے ساتھ)

شادی سے پہلے تھا وہ اک عالم میں انتخاب
تھے مسئلے نہ گھر کے نہ کچھ روزگار کے
بیگم کی خواہشوں نے کیا نیم جاں اسے
آثار اب ہیں چہرے پہ اجڑے دیار کے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

چونا

پاندانوں میں پان ملتے نہیں
اب تو انگارے سب چباتے ہیں
دور آیا ہے آج کل ایسا
چونا کھاتے نہیں لگاتے ہیں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

بے تحاشا موٹا

مٹاپے کے لئے تھوڑی سی سرجری کم ہے
گھٹانے کے لئے اس جسم کو صدی کم ہے
جو غور کیجئے لگتا ہے اس طرح مظہر
کہ اس میں توند زیادہ ہے آدمی کم ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

اِن شاءاللہ

نہیں شاید ٹرمپ کو یہ پتا
گرم ہے وہ تو ''ٹھار'' دیں گے ہم
اس سے پہلے کہ وہ کرے حملہ
اس کو ''خجّکوں'' سے ماردیں گے ہم

نوید صدیقی

اقبالیات

آیئے آپ کو بھی سمجھائیں
ایک نکتہ جو ہم سمجھتے ہیں
ذکرِ اقبال کرنے والے بھی
فکرِ اقبال کم سمجھتے ہیں

نوید صدیقی

شوق میں

مجنوں بنے ہیں، عشق میں لیلیٰ کے ہیں گوی
میخوار ہو گئے ہیں محبت کے شوق میں
آبا ہمارے دیکھیں یہ فیشن کے رنگ ڈھنگ
گھٹنے پہ پینٹ پھاڑ لی جدت کے شوق میں

تنویر پھول

لسّی اور جُوس

تم اب لندن آئے ہو
یار! نہ بننا تم کنجوس
پتلی لسّی چھوڑ بھی دو
پی لو اب نمبر وَن جوس

تنویر پھول

عوام کا خواب

اِک خواب آیا ہے نظر
زر، شر ہیں لٹکے دار پر
فضلو گیا ہے جیل میں
سب کہہ رہے ہیں الحذر!

تنویر پھول

علامتی کوا اور کوئل

کالا کوا آیا تھا
اُس نے راگ سنایا تھا
کوئل شرما کر روئی
اس نے منہ کو چھپایا تھا

تنویر پھول

اَڈّی اور گدّی

اَڈّی بیٹھی ہیں گدّی پر
زر والا چُپ چپ بیٹھا ہے
لوگوں پر خاموشی چھائی
جانے کیا ہونے والا ہے!

تنویر پھول

ایدھی کے ناقد

یاد آیا مُلّا کو ایدھی
اُس میں کیڑے خوب نکالے
نام لیا اسلام کا ، بولے
اُس نے کیسے بچّے پالے !

تنویر پھولؔ

عدل کی تحریک

عدل کی تحریک لے کر چور نکلے ملک میں
عدل سے مطلب ہے ان کا، اپنے حق میں فیصلہ
جتنے ہیں منہ زور گھوڑے، ہو رہے ہیں بے لگام
عدلیہ اور فوج کا پنہاں کہاں ہے دبدبہ !

تنویر پھولؔ

چوری، سینہ زوری

مجھ کو تُو نے کیوں پکڑا ؟
تُو تو ہے کالا مکڑا
میں راکٹ میں جاؤں گا
لے جا تُو اپنا چھکڑا

تنویر پھولؔ

چور اور ڈاکو

کالا ڈاکو کہہ رہا ہے چور سے یہ برملا
تُو نے چوری کی تھی، لازم تھا کہ حصہ بانٹتا
منصفو ! اس کو بھی دیکھو، کچھ کرو اس کا علاج
چور ہے پکڑا گیا، ڈاکو ہے اس کو ڈانٹتا

تنویر پھولؔ

قومی اسمبلی اور فوج کا کردار

مطلب پرست جیتے ہیں پیسے کے زور پر
لٹیا ڈبو دی مجلسِ قانون ساز نے
کوّوں نے احتجاج کیا، شور ہے کیا
کیوں امن کا پیام دیا شاہباز نے!

تنویر پھولؔ

علّامہ کی گالیاں

بھولے ہیں اُسوہ صاحبِ خُلقِ عظیم ﷺ کا
سمجھے ہیں، ان کے ہاتھ میں سب کی رہ نجات
ماتم کناں ہیں علم و ادب ان کے فعل پر
"علّامہ" کی زبان پہ ایسی مُغلّظات!

تنویر پھولؔ

تازہ سیاسی صورت حال

ملکِ پاکستان میں دیکھو سیاسی اجتماع
کچھ تو ہیں ان میں مداری اور کچھ بندر بنے
ملک چڑیا گھر بنا ہے، بندروں کی جنگ ہے
پھولؔ! جو پہلے تھے ڈاکو، اب ہیں وہ رہبر بنے!

تنویر پھولؔ

کھسرے

سنا ہے اس الیکشن میں بھی عاصیؔ
یہاں کچھ درمیانے آ رہے ہیں
ابھی پچھلوں نے کیا کچھ کم نچایا
جواب کھسرے نچانے آ رہے ہیں

مرزا عاصیؔ اختر

گفتگو

فیملی کو کہاں سے لے کے چلوں
راستوں میں تو بُو ہی بُو ہے ابھی
جو گٹر خاکروب کھول گئے
''اس کی خوشبو سے گفتگو ہے ابھی''

مرزا عاصیؔ اختر

گڈ بک

اس کی گڈ بک میں نظر آنا ذرا مشکل ہے
باس کے کام کرو دردِ کمر ہونے تک
اس کو مکھن بھی لگاتے رہو ہر دم عاصیؔ
بس یہی شغل ہو منظورِ نظر ہونے تک

مرزا عاصیؔ اختر

رقیب روسیہ

فربہی اس کی دیکھ کر عاصیؔ
آنکھ بھی مثل آبجو ہے ابھی
جان خطرے میں لگ رہی ہے مجھے
اک پہلوان رو برو ہے ابھی

مرزا عاصیؔ اختر

سات نکاح

ساتوں نکاح کر لئے اک ساتھ شیخ نے
ایسی مثال ملتی ہے اب تو کہیں کہیں
اور اس پہ آپ شیخ کا انصاف دیکھئے
ساتوں کی سات ہر برس امید سے رہیں

محمد انس فیضی

چربے کی شاعری

غالبؔ سے میرؔ سے مجھے رغبت ہے اور کیا
کیوں اس کو آپ کہتے ہیں چربے کی شاعری
مشکل سے چینج کی ہے یہ غالبؔ کی اک غزل
آسان کب ہے دوستو چربے کی شاعری

محمد انس فیضی

واحسرتا!

لحہ لحہ میں دیکھوں خواب اُس کے
لحہ لحہ حقیقتیں پھڑکیں
دل بھرا ہے یوں حسرتوں سے ظفرؔ
جیسے راجہ بازار کی سڑکیں

نوید ظفرؔ کیانی

نااہلیت

اب ہے جس فیصلے کا اندیشہ
سوچتے ہیں وہ ہم کہیں کہ نہیں
اِتنی نااہلیت کے بعد میاں
اہلیہ کے بھی اہل ہیں کہ نہیں

نوید ظفرؔ کیانی

چور مچائے شور

چوروں کا سرغنہ ہوا آتش بجاں بہت
چولہے پہ چڑھ کے اُلٹا توا بیٹھ ہی رہا
انصاف کے خلاف کوئی اُٹھ کھڑا ہوا
یہ اور بات اُس کا گلا بیٹھ ہی رہا

نوید ظفرؔ کیانی

پپو اور میاں

وقت نے کر دیا میاں کو بھی
جیسے بے بس ہمارے پپو کو
نیب کی پیشیاں لگیں ایسے
جیسے پیچش ہمارے پپو کو

نوید ظفرؔ کیانی

سادے نامرادے

اگر آپ میرٹ پہ آتے نہیں
تو پھر جاب چکر سے قابو کرو
یہ کلجگ ہے اِس دور کا ہر سمند
سفارش کے منتر سے قابو کرو

نوید ظفرؔ کیانی

رشوت

کسی سرکاری ایوان میں
کوئی فائل بھی پھنسنے نہ دی
جس کو کہتے ہیں میرٹ ظفرؔ
"ماسٹر کی" ہے ہر قفل کی

نوید ظفرؔ کیانی

فکرِ عافیت

گھر سے باہر خوب پنگے کیجئے
گھر میں فکرِ عافیت ہی ٹھیک ہے
ذکر بیگم کا اگر مقصود ہے
ہجو میں تجریدیت ہی ٹھیک ہے

نوید ظفرؔ کیانی

یقینی بات

مانا خرگوش سے میاں کچھوے
اتفاقاً ہی آگے نکلے ہیں
ہاں مگر دوڑ میں بہر صورت
ریل گاڑی سے جیت سکتے ہیں

نوید ظفرؔ کیانی

مقرر

خوش قسمتی سے دورِ الیکشن پھر آ گیا
اِک مہربان نے مجھے بُک کر لیا شتاب
پہلے بسوں میں بیچتا پھرتا تھا گولیاں
اب انتخابی جلسوں سے کرتا ہوں میں خطاب

نوید ظفرؔ کیانی

نسخۂ کیمیا

اگر ترقی کا ارمان ہے ترے دِل میں
نگاہِ باس میں اپنا مقام پیدا کر
ظفرؔ خودی ہے گوارہ کسے زمانے میں
خودی کو چھوڑ! خوشامد سے دام پیدا کر!!

نوید ظفرؔ کیانی

مماثلت

میرا محبوب بھی آیا نہ ہو واشنگٹن سے
اپنی خوبو میں اُسی خطۂ بیداد سا ہے
بند ہوتا ہے تو عاشق پہ ہی ہوتا ہے ظفرؔ
اُس کا دروازہ بھی امریکہ کی امداد سا ہے

نوید ظفرؔ کیانی

شاہد اطہر

موبائل اور ہم

انسان نے انسان کو تکالیف پہنچانے کی خاطر بہت سی ایجادات کی ہیں۔ کہتے ہیں کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ ہمیں اس سے کیونکر اختلاف ہوسکتا ہے، بس یہ نقطہ نظر میں رکھنا چاہیے کہ "ماں" کی بھی اپنی کچھ ضروریات ہوتی ہیں سو ایجادات کرنا اس کا منطقی نتیجہ ہے۔ حسنِ اتفاق سے یہ فارمولہ انسانی مادہ پر بھی لاگو ہوتا ہے وگرنہ ایک ہی بچے کی پیدائش کے بعد وہ مزید "ایجادات" کی تکلیف کی متحمل نہ ہوسکتی تھی۔۔۔۔

ہمارے ملک کے تو انداز ہی نرالے ہیں۔ یہاں فیشن ضرورت بن جاتا ہے اور ضروری اشیاء کو فیشن بنانے والے دولت کا انبار لگا لیتے ہیں۔ "پر سانوں کی"۔۔۔۔ موبائل فون کا آسیب ۹۰ کی دھائی کے آغاز میں برٹش کمپنی نے مشرف با اسلام کرنے کی خاطر "پاک ٹل" کا نام دیا تھا مزید چارم پیدا کرنے کے لئے افتتاح لیڈی ڈیانا سے کروادیا۔ یوں ہمارے پاک وطن میں "سیلولر فون" جسے غلط العام میں "موبائل فون" کہا جاتا ہے۔ کا آغاز ہو گیا۔ خیال رہے کہ لیڈی ڈیانا کے افتتاح سے قبل اس بدبخت موبائل فون کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور قریباً دو سو نوابین یا بگڑے شہزادوں کے پاس یہ وبا سب سے پہلے پہنچی تھی ہم نے سب سے پہلے سیلولر فون جسے اب ہم بھی موبائل فون ہی کہیں گے غلام مصطفےٰ کھر کے پاس دیکھا تھا۔ موصوف ہوٹل میریٹ (اس وقت ہالیڈے ان) اسلام آباد کی لابی میں اک ادائے بے نیازی سے گزر رہے تھے، ساتھ ان کا ایک ملازم بھاری بھرکم تھیلا اُٹھائے ہوا تھا کہ اچانک اس تھیلے میں سے فون کی گھنٹی بجنے لگی، ملازم نے تھیلا کھولا، کوئی بلی باہر نہ آئی البتہ فون کا ہینڈ پیس اس صاحب کو پیش کیا جس پر انھوں نے بات کرنی شروع کردی۔ ہم سمیت ہر شخص کی نظریں انکی جانب تھیں۔ یعنی کبھی ہم اُن کو کبھی تھیلے کو دیکھتے ہیں..والی کیفیت تھی گھر آ کر بھی ہمیں چین نہ آیا اور وہی تھیلا ہمیں خوابوں میں نظر آنے لگا۔ ہمارے دل میں شدت سے خواہش جاگی کہ ہمارا ملازم بھی اسی طرح تھیلا اٹھائے آئے اور جب ہم فون سنیں تو دنیا ہمیں دیکھے۔۔۔۔ ایک بار نیند میں ہی تھیلا ہمارے منہ پر آن گرا اور بیگم کی آواز گونجی۔۔۔ "اٹھیں اور اتوار بازار سے آلو پیاز لے کر آئیں۔۔۔۔!"

"تم خواب میں بھی ہمیں نوابوں والے شوق پورے نہ کرنے دیا کرو۔۔۔۔" بظاہر ہم شکر ادا کرتے ہوئے ہی اٹھے تھے کہ اگر تھیلے میں سچ مچ کا فون ہوتا تو ہماری گھنٹی بج جانی تھی۔

بیگم دلچسپی لیتے ہوئے بولیں۔۔۔ "کیسا خواب دیکھ رہے تھے۔۔۔ کیا میں ملکہ بنی ہوئی تھی؟؟؟"

''نہیں، تھیلا! ہم خواب میں موبائل فون دیکھ رہے تھے۔''

پھر ہم نے انہیں اس فون کی تفصیل سمجھائی اور یہ بھی بتایا کہ ہمارے من میں کیسی خواہش جاگ اٹھی ہے، حد یہ ہوگئی تھی کہ اگر ہماری منکوحہ ہمیں دوسرے نکاح کی اجازت مرحمت فرما دیتیں اور موبائل فون کی پیشکش ہوتی تو شاید ہم یہ آپشن بھی قبول کر لیتے اِس شرط کے ساتھ کہ جہیز میں فقط اک موبائل کا سوال ہے، خیال رہے کہ اس زمانے میں ''میٹرولا'' کا پورٹ ایبل فون دو لاکھ کا تھا جو ایک مناسب شادی کے جہیز کے لئے بہت ہوتا تھا۔ بہر حال دو سال بیت گئے ۔ اب بھی فقط موبائل فون میریٹ ہوٹل کی لابی میں نظر آتا تھا موبائل فون کی کم مائیگی دیکھیں کہ اس وقت فلموں میں بھی نظر نہیں آتا تھا۔ بہرکیف ، دھیرے دھیرے ''ایگزیکٹو کلاس'' میں یہ بیماری سرایت کرنے لگی اور ہر ادارے کے ٹاپ مین کے پاس فون نظر آنے لگا فون کی قیمت بھی گرنے لگی اور صرف ساٹھ ہزار بمعہ کنکشن ملنے لگا، البتہ مختلف کمپنیوں کے ٹیرف تھے جو لازماً ادا کرنے ہوتے تھے اور جو کم از کم پانچ ہزار تھے کال کرنے کے علاوہ کال سننے کے چارجز بھی ادا کرنے ہوتے تھے۔

موبائل کے اولین دور میں دو کمپنیوں کی اجارہ داری تھی یعنی پاکٹل اور میٹرولا چونکہ ''دل تو ایک ہے'' دونوں پاکستان کی کرنسی کو ڈالروں میں اپنے ممالک میں منتقل کرتے رہے۔۔۔ ہمارے مشاہدے میں یہ بات واضح طور پر آئی ہے کہ کچھوا خرگوش سے جیت جاتا ہے، انکا ذکرِ خیر آگے آئے گا، لہٰذا جس زمانے کی ہم بات کر رہے ہیں وہیں سے ہم بات بڑھاتے ہیں، ۹۰ء کی دھائی کے آغاز میں واپس چلیں۔

ایک انتہائی غیر سہانی شام کہ اس روز ہمارے پاس محترم جو جی ایم کے عہدے پر فائز تھے، کراچی سے تشریف لا رہے تھے اور ہمیں فقط اسلئے ائرپورٹ طلب کر لیا تھا کہ کچھ دفتری کام کے متعلق باتیں ہو جائیں جیسے ہی موصوف ٹرمینل سے باہر نمودار ہوئے، ہمیں ایک زور کا جھٹکا لگا کیونکہ ان کے ہاتھ میں موبائل فون تھا اور ہر نئے موبائلیے کی طرح وہ بھی کسی سے بات کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ سلام دعا ہاتھ کے اشارے سے ہوئی اور کار تک وہ فون پر ہی بات کرتے رہے۔ ہم بھی ان کی بجائے فون کو دیکھتے رہے۔ قریب سے یہ موبائل کے دیدار کا پہلا موقع تھا۔ ان کو میریٹ ہوٹل میں ڈراپ کرنا تھا سو راستے میں کام کی باتیں شروع ہوئیں۔

''سر آپ نے یہ فون کب لیا۔۔۔؟''

''پرسوں۔۔۔'' انہوں نے مختصر جواب دیا۔

''کون سا ہے۔۔۔؟''

''میٹرولا کا ہے، پاکٹل سے لیا ہے۔۔۔''

''اس کی کال کتنے کی پڑتی ہے۔۔۔؟''

''بیس روپے منٹ۔۔۔ اگر سنو تو بھی آٹھ روپے فی منٹ کے حساب سے کٹ جاتے ہیں۔۔۔؟؟''

''کمپنی نے دیا ہے؟''

''ظاہر ہے۔۔۔ میں کیسے افورڈ کر سکتا تھا؟؟؟''

''سر مجھے کب ملے گا۔۔۔؟'' ہم نے خواہش کا اظہار کیا۔

''اچھا تو آپ کو بھی موبائل چاہئے۔۔۔؟ دو چار سال انتظار فرمائیں، کچھ کام کاج کریں پھر دیکھا جائے گا۔۔۔''

''یہ کس چیز سے چلتا ہے، میرا مطلب ہے سیل پڑتے ہیں؟''

''نہیں، چارج ایبل بیٹری سے چلتا ہے''

''کتنی دیر بیٹری چلتی ہے۔۔۔؟''

''چار گھنٹے پھر چارج کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔ ویسے میں نے دو بیٹریاں لے رکھی ہیں۔''

سارے راستے ہم موبائل کے بارے میں پوچھتے رہے اور محترم خوش ہو ہو کے بتاتے رہے۔ شاید وہ بھی یہی چاہتے تھے۔ اب ہوٹل میں ڈراپ کرتے وقت ہم نے باقاعدہ ان کے موبائل کو چھو بھی لیا۔

وقت کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ گزرتا جاتا ہے، کسی کے چاہنے سے رکتا نہیں ہے یوں حسرت و یاس میں ایک سال گزر گیا۔ اب موبائل اکثر بڑے لوگوں کے پاس دکھائی دینے

لگا تھا۔ پھر ایک نئی کمپنی ''انستا'' کے نام سے معرضِ وجود میں آئی ہم نے باقاعدہ اس کی افتتاحی تقریب میں حصہ لیا اور ''نوکیا'' کے نام سے رکھے گئے موبائل فونز کو بڑے شوق و ذوق سے دیکھا۔ موبائل فون کے قد اور قیمت میں بڑی حد تک کمی آچکی تھی، سب سے سستا فون ۳۵ ہزار میں دستیاب تھا۔ ہم اسے خریدنے کی سکت ضرور رکھتے تھے مگر بل ادا کرنے کا حوصلہ ہم میں نہ تھا۔ قصہ مختصر ایک دن ہمیں اپنے باس کا، کانفیڈینشل لیٹر'' موصول ہوا۔ ہم گھبرا گئے کیونکہ اس قسم کے خط میں کوئی نہ کوئی سرپرائز ہوتا ہے، اولین گماں یہی گزرا کہ اس میں لکھا ہوگا آپ کی سروسز کی کمپنی کو ضرورت نہیں۔۔۔ کبھی اس قسم کے خط میں اچانک ہماری ترقی اور تنخواہوں میں اضافے کی خوشخبری ہوا کرتی تھی لیکن چونکہ یہ واقعہ کچھ عرصہ پہلے رونما ہو چکا تھا لہٰذا اب اس کی امید عبث تھی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ خط کھولا، لکھا تھا کہ کمپنی نے آپ کے لئے موبائل اپروو کردیا ہے لہٰذا آپ کمپنی کے خرچ پر موبائل خرید لیں ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ ایسی خوشی ایک مرتبہ پہلے نصیب ہوئی تھی جب بے غم نے عظیم غلطی کرتے ہوئے اِس ناہنجار کا رشتہ قبول کرلیا تھا، بعد میں ہم دونوں کو ہی پتہ چل گیا کہ بڑی خوشی کے پیچھے بہت بڑی غلطی بھی چھپی ہوتی ہے۔۔۔ خیر صاحب! ۹۰ کی دہائی میں ۳۵ ہزار بڑی رقم تھی اور یہی خرچہ اٹھا تھا ایک عدد موبائل خریدنے میں، اس فون کا ماڈل ہم کیسے بھول سکتے ہیں۔ وہ ظالم نوکیا ۳۲۳ تھا، میڈ اِن یو ایس اے معہ تمام تر اضافتوں کے۔۔۔ جیسے ہی ہم فون لے کر دفتر میں وارد ہوئے ہر طرف سے مبارک باد ملنے لگی۔ باقاعدہ اہلِ دفتر کو مٹھائی کھلائی گئی اور سب کو آگاہ کردیا گیا کہ جب بھی ضروری کام ہو ہم سے اس نمبر پر رابطہ کیا جائے۔۔۔ سب سے پہلے ہم نے اپنی بے غم کو فون ملایا۔

''ہیلو ذرا بتاؤ تو ہم کس چیز سے بات کر رہے ہیں؟؟'' ہم نے پوچھا،

''ظاہر ہے فون سے ہی کر رہے ہیں۔۔۔'' وہ بولیں۔

''ارے بھئی یہ کوئی عام فون نہیں ہے۔۔۔۔''

''چلئے خاص ہوگا مگر ہے تو فون ہی ناں!''

''بھئی ہم موبائل سے بات کر رہے ہیں، اپنے دفتر میں بیٹھ کر۔۔۔''

''او، وری گڈ۔ مبارک ہو۔۔۔۔ ویسے موبائل سے دفتر میں بیٹھ کر بات کرنے کی کیا ضرورت تھی کہیں باہر جا کے فون کرتے ناں؟؟؟''

''ٹھیک ہے۔۔۔ ایک طرح سے میرے لئے بھی اچھا ہوا، اب میں آپ کو ٹریس تو کرسکتی ہوں۔''

ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ یہ کیا مصیبت ہونے جارہی ہے، یعنی اب ہم ہر وقت بے غم کی دسترس میں ہوں گے۔؟

ہمیں پہلا فون جو موصول ہوا وہ ہمارے دفتر کے ڈرائیور ریاض کا تھا۔

''مبارک ہو سر۔۔۔!''

''خیر مبارک۔۔۔''

''سر! میں باہر گیا ہوا تھا، مجھے مٹھائی نہیں ملی۔۔۔''

''اس وقت کہاں ہو؟''

''جی میں دفتر میں ہی ہوں۔۔۔''

''ہائیں۔۔۔ پھر موبائل فون پر کیوں بات کر رہے ہو؟''

''پتہ چلا تھا، ضروری بات کرنا ہو تو موبائل پر ہی ہوگی۔''

''نامعقول! موبائل فون پر بات سننے کے بھی پیسے دینے پڑتے ہیں۔''

''صاحب جی! نیا نیا فون تھا سوچا گھنٹی بجادوں۔''

''اچھا، اچھا۔۔۔ لیکن بے کار میں فون مت کرنا۔''

''جی اچھا۔۔۔ لیکن میری مٹھائی؟؟''

''جاؤ اپنے لئے اور لے آؤ۔''

کچھ ہی دیر بعد عام لائن پر باس کا فون نازل ہوگیا۔

''ہیلو کیا موبائل لے لیا؟؟''

''جی۔۔۔''

پھر ابھی تک مجھے نمبر کیوں نہیں دیا؟؟؟ فون آپ کو دفتری کاموں کے لئے دیا گیا ہے'' اضافی بیگمات سے چھڑے اڑانے

کے لئے نہیں۔۔۔''

''سر ابھی پانچ منٹ پہلے ہی تو دفتر آیا ہوں۔۔۔۔''

''موبائل فون سے بات کرنے کے لئے دفتر آنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔۔۔ بندر کے ہاتھ میں ادرک لگ جائے تو اسے سمجھ ہی نہیں آرہا ہوتا کہ اسے استعمال کیسے کیا جائے؟''

''سر آپ مجھے بندر کہہ رہے ہیں؟؟؟''

''نہیں ہر گز نہیں۔۔البتہ میں موبائل کو ادرک کہہ رہا ہوں''

''شکریہ جناب! میں بندر کہلوانا ہرگز پسند نہیں کروں گا کیونکہ بندر کو موبائل کا استعمال نہیں آتا۔۔۔۔ویسے میں نے اس کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا ہے، بے تحاشہ معلومات حاصل ہو رہی ہیں''

''ویسے تو مجھے بھی پورا استعمال نہیں آیا کتاب سے مفید معلومات ملیں تو مجھے بتانا۔''

انہوں نے ہمارا نمبر لے لیا اور۔۔۔۔اور پھر ہماری زندگی اجیرن ہوتی چلی گئی۔نوکری کے اوقات دوگنے بلکہ چوگنے ہوگئے۔اب ہر وقت ان کی دسترس میں تھے، سوائے باتھ روم کے۔۔۔۔موصوف کا فون آیا ہم باتھ روم میں تھے، گھنٹی بجتی رہی۔۔۔پھر فون آیا۔

''فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے؟؟'' ہماری پیشی پڑ گئی۔

''باتھ روم میں تھا۔۔۔''

موبائل باتھ روم میں لے جانے سے کیا آپ کا نشانہ خطا جاتا؟۔۔۔''

''بے غم کہتی ہیں باتھ روم میں بولتے نہیں کیونکہ وہاں نیکی کا فرشتہ نہیں آتا۔انہوں نے تو ہمیں باتھ روم میں گانے سے بھی روک کر قوم کو ایک عظیم سنگر سے محروم کر دیا ہے۔''

''یار آپ فون ہر جگہ لے کر جایا کرو۔ پتہ نہیں، کب مجھے کوئی اچھوتا خیال آجائے اور میں آپ سے بات کرنا چاہوں''

''جی بہتر سر! اگر عین وقتِ نماز آپ کا فون آجائے تو۔۔۔؟''

''اول تو ایسا سال دو سال میں ایک آدھ مرتبہ سے زیادہ نہ ہوگا۔اگر خدانخواستہ ہو بھی جائے تو بٹن دبا کر آپ فون پر اونچی آواز میں نماز پڑھنا شروع کر دیں میں سمجھ جاؤں گا۔۔۔۔۔''

''ٹھیک ہے سر اب وہ بات بھی بتا دیں جس وجہ سے آپ نے چھٹی والے دن صبح ہی صبح فون کیا ہے؟''

''آپ کی بک بک میں وہ بات بھول ہی ہوں۔جب یاد آئے گی پھر فون کروں گا۔۔۔''

فون بند ہوتے ہی ہم نے سوچنا شروع کر دیا کہ اول تو ہم نے فون لے کے شاید بھول کی تھی، دوئم بڑے چاؤ سے اپنے ویزیٹنگ کارڈ پر بھی موبائل فون نمبر چھپوا دیا تھا،اب ہم ہر کسی کی دسترس میں تھے، اب ویسے بھی فونز کا ہمیں جواب دینا پڑتا جن کو کمال ہوشیاری سے ہماری سیکرٹری کہہ دیتی تھی کہ ہم دفتر میں نہیں ہیں، پھر عام فون پر جب کوئی کال کرتا تو اسے معلوم ہوتا کہ میں دفتر میں ہوں مگر موبائل کے ساتھ ایسا نہ تھا۔مثلاً ان ہی دنوں کی بات ہے کہ ہماری سگی خالہ جان رحلت فرما گئیں کہ عین قبرستان میں دفناتے ہوئے موبائل بج اٹھا، ایک خیر خواہ لائن پر تھے چہک کر بولے۔۔۔''مبارک ہو۔۔۔''

''خیر مبارک۔۔۔۔'' ہمارے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''آپ کا ٹینڈر پاس ہو گیا۔''

خیر ہمارے کزن پہلی بار سامنے آئے تو ہم نے فوری ان سے کہا۔۔۔''بڑا افسوس ہوا، یونہی محسوس ہو رہا ہے جیسے میری ماں گزر گئی ہوں۔''

موبائل پر خیر خواہ بولے۔۔۔''کیا کہا افسوس ہوا۔۔۔؟''

''بھائی فون بعد میں کر لینا، میں اس وقت قبرستان میں ہوں۔۔۔۔''ہم نے انہیں صورتحال بتانے کی کوشش کی۔

وہ بولے تو ہم نے فون بند کر دیا یوں ہمیں یہ بھی پتہ چل گیا کہ موبائل کو کام کے وقت بند بھی کیا جا سکتا ہے۔ پھر شام تک مرحومہ کے گھر والوں کے ساتھ یہ خیال ہی نہ رہا کہ فون کھولنا بھی ہوتا ہے،رات کو جیسے ہی خیال آیا تو کھولا اور فوراً ہی گھنٹی بجی،ظاہر ہے دوسری طرف ہمارے باس ہی تھے۔

''موبائل بند کیوں تھا۔۔۔؟؟''

’’ہم جنازے میں تھے۔۔۔‘‘

’’یہ کیسا جنازہ تھا جو سات گھنٹے طویل تھا؟؟ ویسے اگر آپ اسی موبائل سے اطلاع فرمادیتے تو مجھے اتنی زحمت نہ اٹھانی پڑتی ۔۔۔کون مرگیا تھا اور ہاں ’’ٹینڈر کا کیا ہوا؟‘‘

’’خالہ فوت ہوگئی ہیں اور ٹینڈر مل گیا ہے۔۔۔۔‘‘

’’اوہ بہت افسوس ہوا اور بہت خوشی ہوئی ۔۔۔۔ میرا مطلب آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ناں!‘‘

’’جی سر!‘‘

پھر ایک دن ایک دوست خاور کی خوبصورت سیکرٹری کو ہم لنچ چائنیز میں دے رہے تھے اور بات چیت کچھ اس نوعیت کی ہورہی تھی۔

’’شاہد صاحب! آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی!‘‘

’’خاور صاحب بتا رہے تھے محبت میں بڑی چوٹ کھائی ہے آپ نے؟‘‘

’’مس! شادی میں کیا رکھا ہے اور پھر ہم نے محبت میں ایسی چوٹ کھائی ہے کہ۔۔۔‘‘

گزرے ہیں عشق میں ہم کچھ ایسے مقام سے
نفرت سی ہوگئی ہے محبت کے نام سے

’’ویسے آپ بہت رومانٹک نظر آتے ہیں!‘‘

’’ہاں سامنے والا محسوس کرے تو۔۔۔ویسے رومانس کو کس کا دل نہیں چاہتا؟‘‘

عین اس وقت بے غم کا فون آگیا۔

’’ہیلو کہاں ہیں آپ۔۔۔؟؟‘‘

’’ایک میٹنگ میں ہوں بعد میں فون کرنا۔‘‘ ہم نے ٹالنا چاہا۔

’’بہت ضروری بات ہے۔۔۔بیٹے کو بہت تیز بخار ہے۔‘‘

’’دفتر کی گاڑی بھیج دوں۔۔۔؟‘‘

’’نہیں آپ خود آئیں۔۔۔‘‘

’’ٹھیک ہے میں ابھی آتا ہوں‘‘ ہم نے کہا۔

’’کہاں جارہے ہیں؟‘‘ اب وہ مس مخاطب ہوئیں۔

’’گھر۔۔۔میرا مطلب ہے دفتر۔۔۔دراصل دفتر میں ایک بڑا کلائنٹ آچکا ہے اس لئے مجھے جانا ہوگا۔‘‘

’’مجھے محسوس ہوا آپ کسی لڑکی سے بات کررہے تھے؟‘‘

’’ہاں وہ میری سیکرٹری تھی!‘‘

مس مشکوک ضرور ہوگئیں البتہ بے غم کو کوئی شک نہ ہوا۔

ایک دن ہم معہ بیگم اپنے ایک عزیز کے گھر جارہے تھے۔اس عزیز سے ہم نے اپنا دیا ہوا قرضہ واپس لینا تھا جب بھی فون کرتے وہ یہی جواب دیتا یا دلواتا کہ کہیں باہر جارہے تھے یا گئے ہوئے ہیں۔

اُس روز ہم نے اپنی کاران کے گیٹ کے آگے پارک کی اور موبائل سے فون کیا جوان کی زوجہ محترمہ نے اٹھایا ’’جی السلام علیکم بھابی میں شاہد بول رہا ہوں!‘‘

’’وعلیکم السلام کیسے ہیں؟؟‘‘

’’بالکل ٹھیک ۔۔۔دراصل ہم لوگ آنا چاہ رہے تھے کیا میاں صاحب گھر پہ ہیں؟‘‘

’’گھر میں تو نہیں ہیں شاید کلب چلے گئے ہیں کار بھی نہیں کھڑی۔‘‘

’’چلئے کوئی بات نہیں ہم پاس ہی ہیں چکر لگا لیتے ہیں۔‘‘

پھر ہماری گنہگار آنکھوں نے دیکھا کہ میاں صاحب جلدی میں فرار ہورہے تھے اور وہی بھابی صاحبہ گیٹ کھول رہی تھیں۔ اب ہمیں سامنے پا کر کیا منظر ہوا ہوگا ،آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں۔

ایک مرتبہ جمعہ بازار میں خریداری میں مشغول تھے کہ اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی لائن پر ہمارے ہی آفس کی ٹیلی فون آپریٹر تھی۔

’’السلام وعلیکم سر!‘‘

’’وعلیکم السلام۔۔۔۔کیا آج دفتر کی چھٹی نہیں، ہاں کہو؟‘‘

’’مجھے بیس ہزار کی ضرورت پڑگئی ہے۔‘‘

’’کیا شادی کررہی ہو؟‘‘

’’نہیں سر، دراصل ایک پلاٹ کی فوری پے منٹ کرنی تھی سوچا کہ شاید آپ کے پاس ہوں۔‘‘

’’میں جمعہ بازار میں بیس ہزار لے کرنہیں گھومتا۔‘‘

’’گھر پر تو ہوں گے۔۔۔؟‘‘

’’نہیں۔۔۔ویسے میں قرض کا قائل نہیں ہوں، کہتے ہیں کہ قرض محبت کی قینچی ہوتی ہے۔‘‘

وہ بجائے ناراض ہونے کے چہک کے بولی’’اوہ تو آپ کا مطلب ہے۔۔۔اس کا مطلب ہے کہ آپ مجھ سے۔۔۔‘‘

’’ہاں میں ہر اس شخص سے محبت کرتا ہوں جو مجھ سے قرض مانگ سکتا ہے، ادھار محبت کی قینچی ہے اور میں اس قینچی کو حائل نہیں ہونے دیتا۔‘‘

’’سر آپ بڑے وہ ہیں۔۔۔‘‘

’’اچھا اب فون بند کرو۔۔۔فون ریسیو کرنے پر ہمارے پیسے کٹ جاتے ہیں۔‘‘

’’آپ کی مرضی۔۔۔‘‘

ہم تلملا کے رہ گئے، یعنی لوگ ہم سے قرضہ بھی مانگیں اور وہ بھی ہمارے خرچے پر۔۔۔نتیجہ یہ نکلا کہ پندرہ دن میں ہی بیلنس ختم ہوگیا فون بند ہوگیا ہم نے بڑا سکون محسوس کیا، بیگم اور باس دونوں بے سکون ہوگئے۔

کچھ عرصہ بعد ہم موبائل کو سمجھ گئے اور وہ ہمیں۔۔۔شوشا اپنی جگہ کہ جدھر بھی جاتے، لوگ باگ موبائل کو نوٹس ضرور کرتے شاید اس لئے کہ موبائل کے سائز کی وجہ سے، ہاتھ میں پکڑنے کا فیشن تھا۔

اگر چہ اس وقت چند سو کے پاس ہی یہ مصیبت ہوا کرتی پھر انسٹا فون آیا ان کی بہتر مارکیٹنگ کی وجہ سے فونز کی سیل زیادہ بڑھ گئی لیکن ہم جیسوں کو موبائل فون بروقت استعمال کا ابھی شعور نہ آیا تھا جبکہ ماہرِ موبائلیے اس وقت بھی خود ہی اپنے فون کی گھنٹی بجا کر ایسے باتیں کرتے جیسے اہم باتیں کررہے ہوں۔ ہم ایک دفعہ بقول ہمارے دوست کے، ایڈیشنل وائف کو ڈراپ کرنے جا رہے تھے کہ گاڑی خراب ہوگئی۔ کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا کیا جائے بہر حال، محترمہ کو ٹیکسی میں روانہ کیا اور خود دوسری ٹیکسی کی تلاش میں سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ اچانک خیال آیا کہ ہمارے پاس موبائل بھی ہے جو شاید ایسے ہی وقتوں کے لئے ہوتا۔ ہم نے ورک شاپ فون کیا، مکینک آیا اور منٹوں میں گاڑی ٹھیک ہوگئی۔ اب ہمیں یہی ملال رہا کہ محترمہ کو ڈراپ ہونے کے لئے ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔

اب ہمیں موبائل کو بند رکھنے کی خاصی مہارت ہوچکی تھی، اس طرح باس و بے غم سے وقتی طور پر تو بچ جاتے تھے مگر ان کو پرابلم ہوتی تھی، جن کے فون ہم بخوشی سنا کرتے تھے اس عظیم مسئلہ کا بھی ہم نے حل نکال لیا اور ایک کنکشن انسٹا کا بھی اسی فون کی لائن ٹو پر لے لیا۔ اب جب ہم پاکٹل سے انسٹا پر منتقل ہو جاتے تو کوئی مسئلہ نہ ہوتا اور بقول ہمارے اپنے، سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی ٹوٹ گئی لیکن ہمیں خیال ہی نہ رہا کہ زیادہ چالا کی دونوں ٹانگوں سے پھنسواتی ہے۔ ایک بار فون کو انسٹا سے پاکٹل پر منتقل کرنا بھول گئے اور ہمارا یہی خیال تھا کہ پاکٹل پر ہی ہے۔ ہم گھر میں شیو کر رہے تھے کہ فون بج اٹھا۔ ہم نے بے غم سے کہا کہ فون سن لو اور اگر باس کا ہو تو کہہ دینا، ہم موبائل گھر ہی بھول گئے ہیں لیکن دوسری جانب سے ایک حسینہ بولی ’’ہیلو، جانو۔۔۔!‘‘

’’وعلیکم، ہیلو۔۔۔‘‘ بیگم نے چونک کر کہا۔

’’جانو کہاں ہیں؟‘‘ سوال کیا گیا۔

’’جانو شیو کررہا ہے!‘‘ بے غم نے بتایا۔

’’کیا ان سے بات ہوسکتی ہے؟‘‘

’’ضرور ہوسکتی ہے مگر شیو کے بعد!‘‘

’’کیا وہ گھر پر ہیں؟‘‘

’’جی ہاں۔۔۔‘‘

’’آپ ان کے گھر کیا کررہی ہیں۔۔۔؟‘‘

’’کچھ بھی نہیں آپ کے جانو کا دفتر جانے کا انتظار کررہی ہوں۔‘‘

’’اوہ، اچھا۔۔۔آپ کون ہیں؟؟‘‘

’’آپ کے کے جانو کی بیوی۔۔۔!‘‘

باہر والی نے فون بند کردیا، اب گھر والی پھنکارتی ہوئی آئیں۔

’’یہ سب کیا ہو رہا ہے۔۔۔؟‘‘
’’شیبو۔۔۔‘‘ہم نے بتایا۔
’’میں پوچھتی ہوں وہ کون تھی؟؟؟؟‘‘
’’کون۔۔۔کون تھی؟؟بات تم نے کی پوچھ مجھ سے رہی ہو؟‘‘
’’کوئی لڑکی جانو جانو کہہ رہی تھی۔‘‘
’’تمھارے علاوہ بھلا مجھے کون اس نام سے پکار سکتا ہے؟‘‘
ہم نے فون ہاتھ میں لیتے ہوئے دیکھا کہ وہ انسٹا پر ہے اور اطمینان سے بولے ’’فون کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ تو کوئی اور کنکشن شو کر رہا ہے۔تم میرے سامنے فون کر کے دیکھ لو تمھاری غلط فہمی دور ہو جائے گی۔۔۔‘‘
پھر بے غم جان نے کئی مرتبہ ٹرائی کیا، ناکام ہوئیں اور مطمئن سی ہو گئیں مگر اس کے بعد ہم حد درجہ محتاط ہو گئے اور پھر کبھی فون کو غلط فہمی نہ ہونے دی۔
پھر جب موبی لنک نے میدان میں قدم رکھا اور وہیں سے موبائل کی دنیا میں انقلاب آنا شروع ہوا۔
اکا دکا موبائل کی دکانیں بھی کھلنا شروع ہو گئیں۔موبائل کنکشن کئی گنا سستا ہو گیا یعنی چند چند ہزار میں ملنا شروع ہو گیا۔ اٹھائیس روپے منٹ لوکل بات کرنے کا زمانہ بھی گیا۔موبی لنک کیونکہ جی ایس ایم ہے، اس کے لئے سم آ گئی جس کی وجہ سے موبائل سیٹ تبدیل کرنا آسان ہو گیا۔انسان فطری طور پر تبدیلی کو پسند کرتا ہے سب سے مشکل تبدیلی زمان و مکاں کی سمجھی جاتی ہے۔اگر زمان سے مراد بیوی ہی ہو۔
دیکھتے ہی دیکھتے موبی لنک، پاک ٹل اور انسٹا فون کو پیچھے بلکہ بہت پیچھے چھوڑ گیا ایک مرتبہ کچھوا پھر خرگوش کو مات دے گیا۔
ایک روز ہمارے دفتر کا ایک شرارتی انجینئر ہمارے کمرے میں وارد ہوا۔اس کا نام شکیل ہے شرارت سے بولا۔
’’سر!آپ کے پاس کون سا فون ہے۔۔۔‘‘
’’نوکیا۔۔۔‘‘
’’اوہ۔۔۔اگر ’’اریکسن‘‘ ہوتا تو میں آپ کے مزے کروا دیتا۔‘‘
’’ہائیں ۔۔۔ اب موبائل فون مزے بھی کروانے لگا ہے۔؟‘‘
’’جی ہاں اور وہ بھی بالکل مفت۔‘‘
’’مفت کا مزہ اوہ ۔۔۔ ویری گڈ ۔۔۔ جلدی بتائیں ، کیسے۔۔۔؟‘‘
’’سر پہلے اریکسن کا فون لینا پڑے گا۔‘‘
’’بھائی یہ ۱۹۹۹ء ہے،اب فون اتنے بھی مہنگے نہیں۔ہم کوئی استعمال شدہ فون اس اضافی مزے کے لئے لے لیں گے۔‘‘
’’لیکن کنکشن بھی ہونا چاہئے۔‘‘
’’اوہ، وہ بھی ہو جائے گا، پہلے وہ مزے تو بتاؤ۔۔۔؟‘‘
شکیل نے اپنی جیب سے اریکسن کا فون نکالا اور کچھ دیر اس سے کھیلنے کے بعد ہمارے ہاتھ میں تھما دیا ہم نے کان سے لگایا تو دوسری جانب سے دو لوگوں کی گفتگو ہمیں سنائی دے رہی تھی۔
بس بہت ہو گئی، اس (سنسر) کو میں عدالت میں اتنا گھسیٹوں گا کہ یاد کرے گا۔(سنسر)
’’لیکن تمھارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔۔۔‘‘
’’وہ میں دیکھ لوں گا، آخر کہاں جائے گا۔۔۔‘‘
’’بھابھی (سنسر) کیا کہتی ہیں۔۔۔؟‘‘
’’بھابھی مجھے کیا کہے گی ارے اس سارے چکر کی ذمہ دار حمیدہ ہے وہ پوری (سنسر) ہے۔۔۔‘‘
’’بھائی افضل تو ساتھ دیں گے ناں۔۔۔؟؟‘‘
’’ہاں ہاں بھئی۔۔۔وہ کیوں ساتھ نہیں دیں گے۔‘‘
ہم نے شکیل کو فون واپس دیتے ہوئے کہا ’’دلچسپ ضرور ہے مگر اس طرح تو کوئی ہماری باتیں بھی سن سکتا ہو گا۔‘‘
’’سن سکتا ہے مگر یہ طریقہ ایک دو کو ہی پتہ ہے۔۔۔‘‘
’’شکیل، اس کام کے لئے ہم فون نہیں خریدیں گے البتہ آپ اپنے فون سے ہی کبھی کبھار سنا دیا کرنا کوئی دلچسپ گفتگو ہو رہی ہو تو۔۔۔‘‘
’’چلیں ٹھیک ہے۔۔۔‘‘

اب دفتری اوقات میں شکیل اکثر ہمیں ''مزے'' کروانے لگ گیا۔ اس زمانے میں موبائیلئے زیادہ تر لڑکیوں سے ہی باتیں کیا کرتے تھے۔ مثلاً ایک دن شکیل نے ہمیں یہ کہتے ہوئے فون تھما دیا کہ مزہ نہ آیا تو پیسے واپس۔۔۔ ایک جوڑا محوِ گفتگو تھا ظاہر ہے گفتگو ہم نے بیچ میں سے پک کی تھی۔

''تمہیں میری آنکھیں اتنی کیوں پسند ہیں۔۔۔؟''

''کیونکہ تم ان سے مجھے دیکھتی ہو۔۔۔''

''پورے اُلو ہو تم۔۔۔ جب میں سوچتی ہوں، کوئی اچھی سی رومانٹک سی بات کرو گے تو تم بور سا جواب دے دیتے ہو۔۔۔''

''بھئی میں پریکٹیکل شخص ہوں میں صرف رومانٹک باتیں کرنے کا عادی نہیں ہوں۔''

''مثلاً۔ کیا۔۔۔؟''

''تم میری بانہوں میں۔۔۔''

پھر ''مسٹر پریکٹیکل'' نے وہ وہ باتیں شروع کیں کی جنہیں ضبطِ تحریر میں لانا ممکن نہیں۔ ہمیں زیادہ حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ محترمہ بھی اسی فریکونسی پر بات کر رہی تھی۔ اس قدر دلگرفتہ گفتگو ہم نے پہلے نہ سنی تھی، نہ بعد میں کہ ہم نے وہ مشغلہ ہی ترک کر دیا۔

پھر ''یوفون'' بھی میدان میں کود پڑا، ارے وہی جو کہتے ہیں ناں! کہ آپ کے پاس ایم ایم ایس ہے؟ نہیں ہے ناں!۔۔۔ آپ کے پاس جی پی آر ایس ہے؟ نہیں ہے ناں!

پھر موبائل فون کا طوفان آ ہی گیا، اس بات سے اندازہ لگا لیں کہ ۱۹۹۹ء میں پورے ملک میں ۵ لاکھ کے قریب موبائل فون استعمال میں تھے۔ فروری ۲۰۰۵ء تک ان کی تعداد ۹۰ لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے، جس سے صرف موبی لنک کے پاس ۷۵ لاکھ سے زیادہ کنکشن ہیں۔ پھر موبی لنک والے کیوں نہ کہیں۔۔۔ اور سناؤ۔ آخری جی ایس ایم کی قسم پاکٹیل نے خود کو زندہ رکھنے کے لئے متعارف کروائی ہے کیونکہ دل تو ایک ہے۔

سم مفت میں تقسیم ہونے لگیں اور ہر شخص کے لئے موبائل ضروری ہونا شروع ہو گیا لیکن کام سے زیادہ اس کا مقصد وہی رہا یعنی نمود و نمائش۔

چھٹی کے دن ہم اپنے دوست ریاض کی دکان پر کچھ وقت کے لئے ضرور جاتے ہیں۔ دیگر دوست بھی وہیں آ جاتے ہیں۔ ایک گاہک صاحب کو ہم لوگوں نے نوٹس کیا کہ جب بھی وہ دکان پر آتے، کان سے موبائل لگا ہوتا۔ اُن کی ہر دم یہی کوشش ہوتی کہ ہمیں متاثر کریں۔ ہم نے اُن کا توڑ کچھ یوں نکالا کہ جیسے ہی وہ اپنے سٹائل سے آتے، ہم چاروں پانچوں اپنے موبائل فون نکال کر فرضی باتیں شروع کر دیتے۔ مگر اس ڈھیٹ نے قطعی نوٹس نہ لیا۔ پھر ہمیں ایک اور ترکیب سوجھی۔ ہم نے اپنا فون بھنگی کو دیتے ہوئے کہا ''جیسے ہی ہم عام فون سے گھنٹی ماریں، تم اس فون سے بات کرتے ہوئے آ جانا۔''

وہ مسکرایا اور بولا ''صاحب اس کی کیا ضرورت ہے، میرے پاس اپنا موبائل ہے۔''

بہر حال وہ صاحب جب آئے تو ہم نے حسبِ پروگرام بھنگی کو فون ملایا، وہ پاس ہی کہیں تھا، آیا اور بولا ''صاحب اس موبائل نے میری زندگی حرام کر دی ہے، جب بھی گٹر نالی صاف کر رہا ہوتا ہوں، یہ بجنے لگتا ہے۔۔۔ خیر آپ بتائیں کیا بات ہے؟''

''یار جب سے بھنگیوں نے موبائل فون رکھنے شروع کر دئے ہیں، ہمیں تو سکون مل گیا ہے۔۔۔ ہمیں بھی گٹر ہی کھلوانا تھا!''

''ٹھیک ہے، اس وقت تو میں بزی ہوں، بعد میں میرے موبائل پر فون کر لیجئے گا، اور اگر فون بزی ہو تو میسج کر دیجئے گا۔''

وہ یہ کہہ کر چلا گیا۔ اب اِن صاحب کو دیکھو تو ایسے کہ کاٹو تو خون نہیں۔ رہی سہی کسر ہم نے نیاز کو مخاطب کر کے پوری کر دی۔ ''یار جب سے بھنگیوں نے فون رکھنے شروع کر دیئے ہیں، ہمیں تو موبائل استعمال کرتے ہوئے شرم آنے لگی ہے اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ تو شوشا ہی کرتے ہیں، جبکہ بھنگی موبائل کا ٹھیک استعمال کر رہا ہے۔''

اس دن کے بعد ہم نے اس موبائلئے کو نارمل ہی پایا۔

اب چاہو کچھ بڑھ کے۔۔۔ لیجئے ایک اور موبائل کمپنی ٹیلی نار بھی میدان میں آ گئی ہے، اس کمپنی کو وجود میں آنے کے لئے تو

ماہ لگے ہیں، اللہ رحم کرے، اب کمپنیاں بھی نو ماہ میں پیدا ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ صدر پرویز مشرف نے ناروے کے وزیرِ اعظم کو پہلا فون کر کے اس کا باقاعدہ افتتاح کیا اور کہا کہ ہم دہشت گردی کا خاتمہ کر کے رہیں گے جبکہ ہمارے خیال میں موبائل فون خود ایک دہشت گردی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کمپنی نے قطعی نئے انداز میں پبلسٹی کمپین چلائی۔ پندرہ دن یہی کہتے رہے کہ فون سروس ناروے سے چل پڑی ہے، پھر اٹلی ترکی وغیرہ سے ہوتی ہوئی جلد ہی آ رہی ہے۔ بس اس آخری جملے نے پاکستانیوں کے دل جیت لئے اور پھر جس طرح ٹیلی نار کے دفاتر پر پاکستانیوں نے یلغار کی، یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہر کنکشن کے ساتھ ایک خوبصورت نارویجین حسینہ بھی دی جائے گی۔ دیکھنے ہم بھی گئے پر تماشہ نہ ہوا۔ ایک لڑکی کو تو ہم نے یہ کہتے ہوئے بھی سُنا کہ مجھے کیسے ملے گا؟ یقیناً اس کی مراد کنکشن سے ہی ہو گی۔ رش کا وہ عالم تھا جو فقط بحریہ ٹاؤن کے فارموں کے حصول کے لئے ہوا کرتا ہے یا پھر ان سینماؤں ہاؤس میں نظر آتا تھا جہاں ''ٹوٹے'' چلائے جاتے ہیں۔ اشتہارات کی وجہ سے ٹیلی ویژن اور اخبارات کی چاندی بلکہ سونا ہو چکا ہوتا ہے۔ ایک ہی وقت میں کئی کئی اشتہارات چل رہے ہوتے ہیں ''اب چاہو کچھ بڑھ کے'' ۔۔۔ ''اور سناؤ'' ۔۔۔ ''دل تو ایک ہے'' وغیرہ وغیرہ۔

ٹیلی نار کے اس فقید المثال استقبال میں ممد و معاون یہی ''اور سناؤ'' کمپنی ہے جس کے پاس ۸۰ لاکھ سے زیادہ صارفین ہیں۔ آپ کے بیلنس میں سے رقم منہا کرنا ان کی اعلیٰ کارکردگی کی اعلیٰ مثال ہے۔ ذرا سوچیں کہ اگر ایک دن میں فقط ایک روپیہ ناجائز کاٹ لیا جائے تو ۸۰ لاکھ روپے بغیر کسی زحمت کے حاصل ہو جاتے ہیں اور کہتے یہی جاتے ہیں ۔۔۔ اور سناؤ ۔۔۔ جبکہ سنانے والے کی کوئی نہیں سن رہا۔ ستم ملاحظہ ہو کہ اب سو والا کارڈ نکال دیا ہے، جسے آپ لوڈ کر کے بیلنس چیک کریں تو رقم تین ہندسوں سے کمزور ہے اور دو ہندسوں میں باقی رہ جاتی ہے۔

ہمارا بھولا کہتا ہے کہ اعلیٰ افسران کی شرکت بلکہ اشتراک کے بغیر یہ سب ممکن نہیں ۔۔۔ قصہ مختصر، نئی کمپنی کا اس طرح استعمال کیا گیا جیسے ہر نئی آنے والی حکومت کا کیا جاتا ہے۔ امیدِ واثق ہے کہ نئی کمپنی سے عوام کو وہی کچھ ملے گا جو نئی حکومتوں سے ملتا ہے۔ بہر حال کل ہم بھی ٹیلی نار کا کنکشن لینے گئے تھے کیونکہ ہم نے ہر قسم کی سم رکھ چھوڑی تھی اور جس کو فون کرنا ہو وہی سم ڈال لیتے تھے۔ مقصد یہی ہے کہ کثیر سرمایہ بچایا جا سکے۔ اگر چہ اس حرکت سے کئی کمپنیوں کے کارڈ لوڈ کرنے پڑتے ہیں اور بچت سے زیادہ ٹیکس کٹ جاتا ہے۔ پھر جب ہم خود کو ابو جہل کا مرید کہتے ہیں تو کچھ لوگوں کو برا لگتا ہے ۔۔۔ ہم رش دیکھ کر ہی واپس آ گئے تو بے غم گویا ہوئیں ''ٹیلی نار کا کنکشن لے آئے ۔۔۔؟؟''

''جی نہیں، ابھی ہم یورپین سٹینڈرڈ سے محروم ہی ہیں۔''

''ارم کا منگیتر ٹیلی نار میں ہے اسے کہہ کر ہی لے لیں۔''

''اجی چھوڑو اس کنجوس کو، اس نے تو اپنی منگیتر کو بھی موبائل تو کیا ایک سم کا تحفہ بھی نہیں دیا حالانکہ آج کل پہلا تحفہ موبائل فون ہی ہوتا ہے ۔۔۔''

''میں اپنے لئے تو لے آئی ہوں!''

''ہائیں ۔۔۔ کب، کیسے، کہاں سے ۔۔۔؟؟؟''

''حد ہو گئی بغل میں بچہ گلی میں ڈھنڈورا ۔۔۔ آپ کو بھی ہر نئی شے کی طلب ہوتی ہے۔''

''ایسا نہ کہو بے غم تم تو خاصی پرانی ہو چکی ہو ۔۔۔''

''بیوی اور کنکشن میں کوئی فرق نہیں ہے ۔۔۔؟''

''ہے ۔۔۔ بیوی کا کنکشن زیادہ پیسوں میں ملتا ہے۔ سم حاصل کر کے آپ بولتے ہیں پہلی صورت میں بیوی بولتی ہے سم بدلی جا سکتی ہے بیوی نہیں۔ سم گم ہو جائے تو دوسری مل جاتی ہے اور بیوی اوّل تو کوشش کے باوجود گم نہیں ہوتی اگر ہو جائے تو پھر ملتی نہیں ۔۔۔''

''اچھا بازار جائیں تو میرے فون کی جتنی کیسنگ ہو لے آئیے گا ۔۔۔ آج کل فیشن ہو گیا ہے کہ جس رنگ کے کپڑے ہوں اسی رنگ کا موبائل بھی ہونا چاہئے۔''

لو جی یہ کسر رہ گئی تھی۔

''ولید بیٹے کو بھی نیا فون لے کر دیں، کہتا ہے کہ اس فون میں

گیمز اچھی نہیں۔۔۔''

''یہ موبائل فون کیا بن گیا ہے فیشن یا کھیلنے کی شے؟ جسے دیکھو، اس کا غلط استعمال کر رہا ہے کوئی میوزک سننے کے استعمال کر رہا ہے کوئی اسے کیمرے کے طور پر کوئی ویڈیو دیکھ رہا ہے تو کوئی ایم پی تھری چلا رہا ہے۔''

''بھئی ماڈرن زمانہ ہے اور فون تو اب ٹائم پاس کرنے کے لئے بھی بہترین چیز ہے۔''

''جانتی ہو ایک دم میں پانچ کروڑ روپے یہ موبائل فون کھا رہا ہے۔۔۔ ملک میں ایک کروڑ کنکشن ہیں اگر ایک شخص فقط ۵ روپے خرچ کرے تو سمجھ لو بات کہاں جا رہی ہے۔۔۔''

''اوہ یاد آیا۔ بازار جائیں تو ۱۰۰۰ ہزار والا کارڈ لے آئیے گا میرا بیلنس ختم ہو رہا ہے۔''

''اسے کہتے ہیں کہ بھینس کے آگے بین بجانا!''

''آپ کی اردو ہمیشہ سے ہی خراب ہے۔۔۔ بین سانپ کے آگے بجائی جاتی ہے۔''

بے غم نے ہماری اصلاح کی اور ہم ان کی اصلاح کی خاطر ان کی فرمائشیں پوری کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

چند سالوں سے موبائل فون کی ''ضرورت'' خواتین میں بیحد بڑھتی جا رہی ہے۔ اوّل اوّل پاکستان کی فلمی ہیروئینز کو اس کی ضرورت پیش آئی پھر غیر شریف بیویوں کو موبائل کی افادیت کا پتہ چلا۔ شریف بیبیاں کیوں پیچھے رہتیں، انہوں نے اسے فیشن کا حصہ بنا لیا۔ اسلام آباد کی ہر دوسری فی میل کے پاس موبائل ہوتا ہے اور زیادہ مشغول و مصروف خصوصاً کام کرنے والیوں نے تو دو دو فون رکھے ہوتے ہیں۔ دوسرا فون صرف سننے کے لئے ہوتا ہے اور یہ نمبر دفتر اور گھر والوں کے پاس نہیں ہوتا۔ ایک عاشق نے شکایت کرتے ہوئے کہا ''جان تم نے مجھے اپنا موبائل نمبر نہیں دیا ہوا؟''

''اس لئے کہ تم میرے باپ نہیں ہو۔'' جواب ملا۔

موبائل فون کا زیادہ زنانہ استعمال قطعی شریف خواتین اور لڑکیاں کر رہی ہیں۔ شکر ہے کہ ابھی دوسری شرح دس فیصد ہی ہے۔ چند دن پہلے ہی میریٹ ہوٹل میں ہم اپنے ایک دوست کو ہائی ٹی پیش کر رہے تھے۔ برابر والی ٹیبل پر ایک مس دو نمبر بیٹھی تھیں۔ ہماری طرح اکثر لوگ ایک نمبر اور دو نمبر میں بخوبی فرق محسوس کر لیتے تھے۔ مس قابلِ دید تھیں۔۔۔ مس ہمارے اس قدر قریب تھیں کہ ہم ان کے موبائل کا ماڈل دیکھ ہی رہے تھے جو ''نوکیا ۶۲۳۰'' تھا اور ''نوکیا ۶۶۰۰، ۵۱۰۰ کے'' کی طرح کیمرے، بلوٹوتھ، ویڈیو، ریکارڈنگ سے لیس۔ وہ بھی ایک گانا اس پر دیکھتی، کبھی دوسرا، پھر اس نے کسی کا فون ملایا، ستم ظریفی یہ تھی کہ ہم صرف یک طرفہ بات چیت سن سکتے تھے یعنی وہ جو کچھ بول رہی تھی۔

''پتہ نہیں کہاں مر گیا ہے۔۔۔ لو ایسے ہی آ جاؤں۔۔۔ اور سناؤ کیا حال چال ہے؟ بڑے دنوں بعد بڑا مرغا ہاتھ لگا ہے، ہر وقت بزی رہتا ہے۔ لیکن میرے لئے وقت نکال لیتا ہے۔۔۔ بھئی میریٹ میں اور کہاں؟؟؟ نہیں یہاں کے علاوہ کہیں کھاتا پیتا نہیں ہے۔۔۔ ہاں ہاں، اس دن کمرہ بھی یہاں ہی لیا تھا۔ سیف ہوتا ہے ناں۔۔۔ نہیں یہ میں نے نہیں پوچھا۔۔۔ بھئی مجھے اس سے کیا، میرا تو بڑا خیال رکھتا ہے مگر آج نہ جانے کہاں بزی ہو گیا ہے۔۔۔ میں نے تو ابھی کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہے۔ سچ میں بڑی بھوک لگ رہی ہے۔۔۔ یہاں اکیلی بیٹھی بہت بور ہو رہی ہوں۔۔۔ اچھا اوکے، اللہ حافظ پھر بات ہوگی۔''

مس پھر ادھر ادھر دیکھنے لگی اور موبائل سے کھیلنے لگی۔ کچھ دیر بعد جی اوب گئی تو ویٹر کو بلا کر بولی ''میں ذرا واش روم سے ہو کر آتی ہوں یہ جگہ ریزرو ہی رکھنا''

''اچھا میڈم۔۔۔!''

''اور یہ میرا موبائل تھوڑی دیر چارج پر لگا دو، کہیں بیٹری جواب ہی نہ دے جائے اور میرے امپورٹنٹ فون مس نہ ہو جائیں۔۔۔''

''اچھا میڈم۔۔۔!''

دس منٹ بعد واش روم سے فریش میک اپ کی تہہ چڑھا کر واپس لوٹ آئیں اور آتے ہی ویٹر سے اپنا فون طلب کیا، پھر فون ملایا۔

''دو گھنٹے سے تمھارا انتظار کر رہی ہوں، کیا مجھ سے دل بھر گیا ہے؟۔۔۔پھر ابھی تک آئے کیوں نہیں، اب اور انتظار کروں کتنا؟'' بھئی میں بور ہو گئی ہوں۔ نہیں آنا تو بتا دو میں واپس چلی جاتی ہوں۔۔۔میں نے تمھاری ہائی ٹی کے چکر میں لنچ بھی نہیں لیا ۔۔۔یہ کیسے ہو سکتا ہے میں یہاں اکیلی ٹھونسے نہیں آئی، بس فوراً آؤ، میں دس منٹ اور انتظار کروں گی۔''

فون بند کر کے وہ پھر فون سے کھیلنے لگی۔ ویسے بھی آج کل فون کام سے زیادہ تفریح کا سامان ہو چکا ہے۔ ہم کافی دیر سے اس کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ لباس انگریزی اور انتہائی چست دھان پان سی اپنے وزن کے برابر میک اپ چڑھایا ہوا تھا۔ بار بار اپنے بیش قیمت موبائل کی طرف دیکھتی۔ اکیلی تھی جس کا مطلب تھا کسی کے انتظار میں ہے۔ ہم نے اپنا کھانا پینا شروع کیا اور وقت کے ساتھ اس کی بڑھتی ہوئی بے چینی بھی دیکھتے رہے۔ ہمارے مہمان نے ہم سے پوچھا کہ لڑکی تو بڑی زبردست ہے مگر بڑی بے چین نظر آ رہی ہے۔

''بے چین وہ بھوک کی کی وجہ سے ہے اس کا میزبان ابھی تک نہیں آیا ہے۔۔۔'' ہم نے کہا۔

پھر مس نے خود ہی کسی کو فون کیا۔۔۔الٹے سیدھے چہرے کے تاثرات بنائے منکتی ہوئی اٹھی اور ڈھیر سارا کھانا، کھانے کو لے آئی۔ کچھ دیر بعد کچھ اور ہی نظارہ ہو گیا۔ ان مس کے میزبان نے شاید اپنا موبائل بند کر دیا تھا اور بل دینے کے لئے مس کے پاس پیسے نہیں تھے اور ان کی پریشانی قابلِ دید تھی۔ اب ان کا موبائل بیکار ہو گیا تھا، لیکن پھر وہی موبائل فون ہی ان کے کام آ گیا جس کو اس نے ضمانت کے طور پر کاؤنٹر پر جمع کروایا اور پیر پٹختی ہوئی وہاں سے روانہ ہوئی۔ ہوٹل والوں نے بھی سارا کام اس آہستگی اور خوش اسلوبی سے کیا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ہماری اور بات تھی کے ہم تو سب کچھ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

اسلام آباد کی ''موبائلوں'' (لڑکیوں) کے تو انداز ہی نرالے ہیں۔ شریف ہیں لہٰذا کپڑوں کی طرح محبوب نہیں بدلتیں موبائل بدلتی ہیں ذرا ملاحظہ ہو۔۔۔ جناح سپر مارکیٹ کی ایک بڑی موبائل شاپ پر ہم کھڑے ہیں کہ چار عدد الٹرا ماڈل لڑکیاں داخل ہوتی ہیں۔ اب ان کی دوکاندار سے بات چیت شروع ہوتی ہے۔

''آپ کے پاس کوئی اچھا سا موبائل ہے۔''

''جی آپ کو کون سا چاہئے؟''

''بس جو اچھا سا ہو۔۔۔''

''مثلاً نوکیا ۳۱۰۰ دیکھ لیں اس میں پولی فونک ٹیونز ہیں۔ ایم ایم ایس ہے اور جی پی آر ایس ہے۔''

''نہیں یہ سب نہیں بس فون اچھا ہو اور نوکیا نہ ہو۔ میں نوکیا بہت استعمال کر چکی ہوں، بور ہو گئی ہوں۔''

''پھر یہ سونی اریکسن دیکھیں پی ۷۰۰ آئی یہ ۱۸۰۰۰ کا ہے اور یہ پی ۵۰۰ آئی، ۱۲۰۰۰ کا ہے۔''

''سیمنز کا کوئی دکھائیں۔۔۔''

''یہ دیکھیں ایل ۶۵ ہے بڑا زبردست فون ہے۔''

''کوئی اور۔۔۔''

''یہ سینڈو دیکھ لیں، کیمرہ کے ساتھ صرف ۵۵۰۰ سو کا ہے یا پھر ایل جی یا پاکٹل کا دیکھ لیں۔۔۔''

''وہ سامنے کون سے ڈبے پڑے ہیں؟''

''جی سام سنگ کے ہیں اس کا ایکس ۱۲۰ نیا آیا ہے۔''

''مجھے سام سنگ کا ایکس ۶۰۰ دے دیں۔۔۔ کتنے کا ہے؟''

''جی بارہ ہزار کا صرف۔۔۔''

''میرا فون کتنے کا لیں گے۔۔۔۔نوکیا ۲۱۰۰ ہے پچھلے ماہ ۴۵۰۰ کا لیا تھا۔''

''اس کیلئے میں ۱۵۰۰ دے دوں گا۔۔۔ڈبہ کھل چکا ہے نا!''

''نہیں نہیں یہ بہت کم ہیں کم از کم دو ہزار تو دیں۔''

پھر دوکاندار نے حیل وحجت کر کے اس کے فون کے ۱۸۰۰ لگا دئے اور پورے منافع بخش قیمت پر اپنا فون بھی بیچ دیا۔ ایک اور لڑکی نے بھی اسی قسم کا سودا کیا، باقی دو نے نہیں کیا کیونکہ ان کے فون کو ابھی ایک ماہ بھی نہیں ہوا تھا۔

چند سال پہلے ہماری بے غم کو بھی موبائل یعنی اہلِ موبائل ہونے کا شوق چڑھا۔

''ایک موبائل مجھے بھی لے دیں۔۔۔''

''ضرور لے دیں گے مگر تمھیں اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''نہیں۔۔۔لیکن مجھے چاہیئے۔''

''صرف فیشن میں۔۔۔؟''

''بالکل۔۔۔اب تو جس کو دیکھو موبائل لئے پھرتا ہے۔''

''چلو بھئی تم بھی فیشن پورا کرلو۔۔۔کون سا فون چاہیئے؟''

''یہی جو نیا آیا ہے نوکیا ۱۱۰۰۔۔۔''

''فون ہی لینا ہے تو کوئی بڑھیا والا لو ورنہ چند دن بعد تبدیل کرتی پھرو گی۔۔۔یوں کرو نوکیا ۶۱۰۰ لے لو۔۔۔خالص خواتین کا فون ہے جو مرد بہت خوشی سے لئے پھرتے ہیں۔''

''نہیں۔۔۔مجھے نوکیا ۱۱۰۰ ہی پسند ہے۔۔۔اس کی گرپ اچھی ہے۔ٹارچ بھی ہے۔''

''تمھاری مرضی۔۔۔ہم تو تمھیں زیادہ اچھا والا فون لے دیتے۔''

پھر انہوں نے نوکیا ۱۱۰۰ لے لیا جو لیڈیز فون ہی ہے، جب سے ان کے پاس فون آیا ہے، سارے خاندان والیوں کو گھنٹیاں مارتی پھرتی ہیں اور جواب میں وہ سب ان کو گھنٹیاں مارتی رہتی ہیں اور یہ کام اس قدر مستقل مزاجی سے ہو رہا ہے، کہ بیان سے باہر ہے۔

خواتین موبائلوں کی بات ہو رہی ہو اور گولڈ میڈلسٹ زن مرید انصر مہدی کی بیوی کا ذکر نہ ہو، کیسے ممکن ہے۔۔۔۔بیگم انصر ملازمت کرتی ہیں جہاں سے انہیں ۳۵۰۰ لمٹ والا فون ملا ہوا ہے۔ پھر دفتر کا فون بھی مفت اور ڈائریکٹ ہے، دوسری طرف انصر صاحب کے پاس یہی سہولیات من وعن ہیں۔ دونوں میاں بیوی پاگل ہرگز نہیں کیوں کہ پاگل اتنے بھی پاگل نہیں ہوتے جتنے یہ میاں بیوی ہیں۔ایک دن میں بیوی صاحبہ پورے بیس فون کرتی ہیں اور انصر صاحب بیس سے پچیس فون کرتے ہیں۔اب اس کو ۳۶۵ دن سے ضرب آپ خود دے لیں اور آخر موبائل کمپنیاں ایسے ہی تو یومیہ کروڑوں روپے نہیں کما رہی ہیں۔اب اتنے فون ملائے جائیں گے تو باتیں کیا ہوتی ہوں گی۔ان کی جھلک بھی دیکھ لیں۔۔۔۔بیگم کراچی اور موصوف اسلام آباد میں ہیں۔

''ہیلو، انصر کیا حال ہے۔''

''ٹھیک ہوں۔۔۔تم نے بجلی کا بل جمع کروا دیا تھا؟''

''ہاں۔۔۔۔اچھا جانو میں پھر فون کرتی ہوں۔۔۔''

ایک گھنٹے بعد پھر فون کیا۔

''ہیلو انصر کیا حال ہے؟''

''ٹھیک ہوں۔۔۔''

''تمھارا باس اس وقت کیوں بیچ میں آتا ہے جب تم مجھ سے بات کر رہی ہوتی ہو۔''

''منحوس ہے۔۔۔ذرا ہولڈ کروا یا پھر آدھے گھنٹے بعد فون کر لینا۔''

آدھے گھنٹے بعد انصر صاحب فون کرتے ہیں۔

''آدھا گھنٹہ ہو گیا۔۔۔؟؟''

''شاید۔۔۔کیا تمھارے پاس گھڑی نہیں ہے؟''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو۔۔۔؟؟''

''کچھ بھی نہیں۔۔۔گھڑی رکھو تا کہ تمھیں اپنی اوقات یاد رہے۔''

''تم بدتمیز ہو۔۔۔''

''تم سے کم۔۔۔''

انصر صاحب غصے میں فون بند کر دیتے ہیں پھر دس منٹ بعد فون کرتے ہیں۔

''تم نے مجھ سے مذاق کیا تھا؟؟؟''

''ہاں۔۔۔''

''سوری بولو۔۔۔''

''تم نے فون بند کیا تھا تم سوری بولو۔۔۔''

انصر صاحب پھر فون بند کر دیتے ہیں۔

پھر آدھے گھنٹے بعد محترمہ کا فون آتا ہے۔

''ہیلو انصر کیا حال ہے۔۔۔؟''

''تم سوری نہیں بولو گی تو میں بات نہیں کروں گا۔۔۔''

''اچھا بابا سوری۔۔۔''

اب محترمہ نے فون بند کر دیا۔
گھنٹے بعد انصر صاحب فون کرتے ہیں۔
''میں سوری کیوں بولوں؟''
''کیونکہ تم نے فون بند کیا تھا۔۔۔''
''اچھا بھئی سوری وہ یاد آیا بجلی کا بل جمع کروا دیا تھا؟''
''وہ انصر، باس نے بلایا ہے بعد میں بات ہوگی۔''
موبائل پھر بند ہو گئے تھوڑی دیر کے لئے۔
موبائل فون کی اب اپنی ایک دنیا بن چکی ہے۔ لاکھوں لوگوں کا روزگار اس سے منسلک ہے۔ اب وہ دن بھی دور نہیں کہ جب ٹھیلے پر آوازیں لگا کر موبائل سیٹ فروخت ہوا کریں گے اور بعید نہیں اس قسم کی آوازیں سنائی دیا کریں گی۔
''موبائل لے لو۔۔ موبائل لے لو۔۔۔ ۔۔نوکیا ہے، سیمنز ہے، سونی ایرکسن ہے، بھائی ہر فون صرف ہزاروں روپے میں بمعہ کنکشن ہے۔۔۔۔موبائل لے لو۔۔۔۔ پرانا فون دے دو۔۔۔نیا فون لے لو۔۔۔''
پاکستانی موبائلیوں کو موبائل فون کا بخار چڑھا ہوا اور دہشت گرد اِس سے استفادہ نہ اٹھائیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے لہٰذا جرائم کی دنیا میں موبائل کو وہ مقام ملا جو جوان مرد کی آنکھوں میں قابلِ دست انداز حسینہ کیلئے ہوتا ہے۔ قانون جرم سے ہمیشہ پیچھے ہوا کرتا ہے اسی لئے پہلے جرم ہوتا ہے پھر اس کے تدارک کے لئے قانون بنتا اور حرکت میں آتا ہے۔۔۔ ایرو سسٹم یعنی انسٹا اور پاک ٹل کو قانون آسانی سے ٹریس کر لیا کرتا تھا مگر جی ایس ایم موبی لنک کو ٹریس کرنے کا ساز وسامان نہ تھا موبی لنک کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی رہی ہو۔
''اور سناؤ!'' کراچی میں ایک طویل عرصے کے لئے موبی لنک کی سروسز کو حکومت نے جبری بند کرا دیا۔ پھر مشینری آئی اور جب حکومت کو اطمینان ہو گیا کہ اب وہ ہر شہری کی گفتگو سن سکتی ہے تو پھر سروسز بحال کر دی گئیں۔ اب ہر شخص کی ایک ماہ کی گفتگو یا پیغامات کا مکمل ریکارڈ رکھنا ان کمپنیوں کی لازمی ذمہ داری ہے۔ پھر سم میں ڈالے گئے تمام نمبرز کمپنیوں کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔ گویا ایک موبائل کے استعمال سے آپ نے اپنی ''پرائیویسی'' ختم کر ڈالی ہے۔ یہی سچ ہے کہ ان اقدامات سے خاطر خواہ افاقہ ہوا ہے البتہ لڑکے لڑکیوں کی فونز کالز ابھی بھی دہشت گردوں کی لسٹ میں نہیں آئیں وگرنہ ظہارِ محبت بھی قابلِ دست اندازئ پولیس ہو جاتا۔ کیونکہ ''دل تو ایک ہے'' اور پولیس پوچھتی'' آپ کے پاس شرم وحیا نہیں؟؟؟۔۔۔نہیں ہے نا!
ایک ٹیلی فون کمپنی ہے ''تھوریا'' یہ ایک سیٹلائٹ کنکشن ہے جس کا کنکشن مہنگا بہت ہے مگر تمام موجودہ ہائی ٹیک ٹیکنالوجی بھی اس کا توڑ نہیں نکال سکی۔ اس سسٹم کو شہرتِ دوام اسامہ بن لادن نے پہنچائی۔ ان کے زیرِ استعمال یہی کنکشن رہا ہے مگر امریکہ بہادر جن کا دعویٰ تھا کہ وہ افغانستان کے پہاڑوں میں چھپے چوہے کو بھی ڈھونڈ نکالتے ہیں، وہ اس کے فون ٹریس نہ کر سکے۔ ادھر امریکہ اسامہ کے مرنے کا اعلان کرے، ادھر اسامہ ''تھورایا'' فون سے پریس کانفرنس کر دے۔ حیرت اس بات کی ہے امریکہ نے اس کمپنی کو ختم کیوں نہ کیا۔ ظاہر ہے اس لئے کیونکہ وہ کس مسلمان ملک کی کمپنی نہیں ہے۔
موبائل فون کا کام صرف فون کرنا اور فون سننا ہوا کرتا تھا مگر آج کل موبائل کیا کرتے ہیں۔۔۔ ٹریفک کے بیک گراؤنڈ میں صاحبزادے فوٹو کھینچ کر باس کو ایم ایم ایس کر دیتے ہیں ''باس ٹریفک میں پھنس گیا ہوں۔۔۔''
پھر بلے گلے میں مصروف ہو جاتے ہیں، واللہ نئی نسل کو کیسی تربیت دی جا رہی ہے۔
آج کل فون کرنے کے علاوہ اور کیا کچھ کرتے ہیں اس کی جھلک ہم آپ کو اپنے موبائل فون سے ملوا کر دیتے ہیں۔ موصوف کا اسمِ شریف نوکیا ۶۶۷۰ ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کا شاہکار ہے۔ ایک پیغام اگر سو لوگوں کو ارسال کرنا مقصود ہو تو اتو بس ایک بٹن دبائیں باقی کام وہ خود کرتے ہیں۔ ویڈیو فلم بناتے ہیں تصویر بناتے ہیں پھر فون میں ہی سہولت ہے کہ ایڈیٹنگ کر لیں، بیک گراؤنڈ میوزک لیں۔ ویڈیو گانے اور ایم پی تھری میوزک سے لیس ہے۔ ۵۱۲ ایم بی کی میموری کارڈ میں پورے چار انگلش یا دو

انڈین فلمیں ڈل جاتی ہیں جو دورانِ سفر وقت کاٹنے کا اچھا ذریعہ ہیں۔ ہفتے میں ایک آدمی کا پورا جغرافیہ رکھا جا سکتا ہے۔ یعنی دس قسم کے ٹیلی فون نمبر، تین ای میل ایڈریس، تین ویب سائیڈ ایڈریس، دفتر اور موبائل کے پورے مکمل پتے، سالگرہ نوٹس وغیرہ وغیرہ اور اس قسم کی ۵۰۰۰ انٹریز کی گنجائش ہے۔ رنگ ٹونز، وال پیپر اور سکرین سیورز کا شمار ہی نہیں۔ مکمل کمپیوٹر ہے جس میں ورڈ، ایکسل، اور پاور پوائنٹ موجود ہیں۔ گیمز اتنی ہیں کہ بچوں کو کرائے پہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ تمام ڈیٹا عام پرنٹر سے لگا کر پرنٹ کیا جا سکتا ہے۔ اعلیٰ قسم کے کیکولیٹر کے علاوہ شاہکار قسم کا کنورٹر بھی ہے۔ ایک ہی وقت میں پاکستانی کرنسی دیگر پچاس ممالک سے کنورٹ کر کے بتا دیتا ہے۔ ویسے ہر ملک سے مطابقت کی گنجائش ہے، ہر قسم کے پیمانوں، درجۂ حرارت اور فاصلے اوزان وغیرہ کو احسن سٹائل میں کنورٹ کر دیتا ہے۔ وائس ریکارڈنگ، وائس کمانڈ کا یہ عالم ہے کہ ہر موبائل کا ہر فعل آپ کی آواز سے چلتا ہے۔ انٹرنیٹ کا استعمال عام کمپیوٹر کی طرح کرتا ہے۔ اپنا ذاتی موڈیم ہونے کی وجہ سے دورانِ سفر انٹرنیٹ کا استعمال با آسانی فراہم کرتا ہے۔ کوئی سی بھی سائٹ پر آرام سے لے جاتا ہے۔ اپنے ای میلز کو چیک کرنا یا ای میلز کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ ہر قسم کی ڈاؤن لوڈنگ کی صلاحیت کی وجہ سے مزید سافٹ وئیر ایڈ کرتے رہتے ہیں۔ موصوف میں لائف بلاگ نام کا سسٹم بھی ہے جو آپ کی ہر ایکٹویٹی کو محفوظ رکھتا ہے۔ جب تک اسے کمپیوٹر سے منسلک نہ کر دیا جائے اور یہ سب کچھ کمپیوٹر سے منسلک ہے۔ ہم کمپیوٹر میں نام پتے ڈالیں، وہ فون پر آٹو میٹک منتقل ہو جاتے ہیں۔ ہم فون سے ای میل بھیجیں، ویڈیو بنائیں، کچھ کریں وہ کمپیوٹر پر منتقل کر دیتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ،، بلوٹوتھ کی وجہ سے یہ تمام کام بغیر کسی تار کے ہی ہوتے ہیں۔ جو بھی فون یا ڈیوائس ''بلوٹوتھ'' رکھتی ہو، ہم اس سے کچھ بھی اپنے فون پر منتقل کر سکتے ہیں یا ارسال کر سکتے ہیں بغیر پیسوں کے۔۔۔ سو سال کا پروگرام اپیل کلینڈر ہے گویا ہم اپنی وفات کے بعد کے چھہتر سالہ پروگرام بھی اس میں ڈال سکتے ہیں۔ بیسیوں قسم کے الارم، قصہ

> نہانا وہ کام ہے جس میں جسم کے تمام عضوا کھٹے ہو کر حصہ لیتے ہیں۔ اگر ایک عضو بھی بھیگنے سے انکار کر دے تو نہانے کا لطف جاتا رہتا ہے۔ نہانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کپڑوں کی آلائش سے پاک ہوں۔ غسل خانے میں چٹخنی لگی ہو اور ساتھ چائے یا کافی نہ سہی مگر پانی کافی ہو۔ نہانے کا آغاز آپ اپنی پسند کے کسی بھی عضو سے کر سکتے ہیں۔ پہلے انسان کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر نہاتا تھا مگر نئی ایجادات کی بدولت لیٹ ہی سہی مگر اب وہ نہانے کے لیے لیٹ بھی سکتا ہے۔ نہانے سے جسم، صابن، شیمپو اور تولیہ بنانیوالوں کو راحت ملتی ہے۔ باتھ ٹب نے باتھ روم کو بیڈ روم میں تبدیل کر دیا ہے۔ اب آپ بیڈ روم والا ہر کام باتھ روم میں کر سکتے ہیں۔
>
> **نہانا از مرزا یاسین بیگ**

مختصر، اس فون میں اس سے بہت کچھ زیادہ ہے جو بیان کیا گیا۔ رہی بات فون وصول کرنے کی تو اس بیش قیمت فون پر بھی وہی ملتا ہے جو چند ہزار کے فون پر ملتا ہے یعنی بیگم کہتی ہیں ''واپسی پر آلو پیاز لیتے آیئے گا۔''

موبائل کی دنیا میں ایک جدت ''وارنٹی'' کے نام سے بھی ایک بیماری کی طرح پھیل چکی ہے۔ چند ذہین لوگوں نے دولت کے انبار لگانے کے لئے ''وارنٹی'' کا نعرہ لگا کر فروخت کرنے شروع کر دیئے۔ بغیر ''وارنٹی'' کے اب وہی فون میسر ہیں جو پاکستانی بھائی یورپ سے چوری کر کے لاتے ہیں۔ یورپ میں ''اورنج، ایپل'' وغیرہ کے کنکشن کے ساتھ فون مفت ملتا ہے اور کنکشن بھی قسطوں پر۔ یار لوگ ایک قسط دے کر فون پاکستان لے آتے ہیں اور اسے فروخت کر دیتے ہیں۔ کمپنیوں نے وہ فون لاک کئے ہوتے ہیں مگر پاکستانی ''ماہرین'' ہر قسم کے لاک کھول دیتے ہیں۔ چین کے ایک اقتصادی انقلاب نے تباہی مچا دی یا اب نیا فون ہی اصلی فون ہوتا ہے۔ اس کی کیسنگ، بیٹری، چارجر، ہینڈ فری ہر شے میڈ ان چائنہ ہوتی ہے۔ ہمیں تو اس دن کا انتظار ہے جب میڈ ان چائنہ بیویاں بھی مارکیٹ میں آ جائیں گی۔ ایک زمانہ تھا کہ گورے کی بڑی ویلیو ہوا کرتی تھی، اب وہ زمانہ ہے کہ گورا بھی چائنہ کے مال کی قدر کرتا ہے۔ سونی ایریکسن کے تو تمام فون ہی چائنہ میں

بنتے ہیں۔۔۔سینڈو جو ہالینڈ کا بنا ہوا فون ہے، اس کی بیٹری میں لکھا ہے ’’انگلینڈ کی بنی ہوئی‘‘ جس میں اصلی سیل چائنہ کا استعمال کیا گیا ہے۔ پیسے کی ریل پیل کے کاروبار میں بے ایمانی بہت جلد سرایت کر جاتی ہے۔ دوکاندار جی کھول کر گاہک کو لوٹ رہے ہیں، گاہک خوشی سے لٹ رہے ہیں۔ کمپنیاں گاہک کو بھنبھوڑ رہی ہیں، وہ خوشی سے کٹتے جا رہے ہیں۔ کسی نے نیا فون خریدا، پسند نہ آیا، دوسرے دن تبدیل کرنے گیا تو دوکاندار نے ۳۵ فیصد کاٹ لئے۔ فون میں کارڈ ڈلوا کر بیلنس چند دن بعد چیک کیا تو کئی سو کٹے ہوئے ہیں، کوئی پوچھنے والا نہیں ہے اور پوچھنے والوں کے موبائل مفت چل رہے ہیں۔ اس موبائلی دور میں سلامی میں موبائل پیش کیا جاتا ہے۔ رشوت میں موبائل نذر کیا جاتا ہے، تحفہ میں موبائل دیا جاتا ہے، محبوبہ کو موبائل دیا جاتا ہے، الغرض موبائل ہی موبائل ہو گیا ہے۔۔۔ بچے نے امتحان پاس کیا، موبائل ملا، شادی میں کیا دیں، موبائل دیں۔ سالگرہ پر کیا دیں، بڑی آسانی ہو تو موبائل ورنہ کنکشن دینے کا بھی فیشن ہے۔

اگرچہ ہم موبائل فونز کے استعمال کرنے والوں میں بہت پرانے ہیں مگر اب جی اوب سا گیا ہے کیونکہ موبائل کے وائرس نے ہمارے معاشرے کو بری طرح جکڑ لیا ہے۔ دنیا کی اکانومی میں ہمارا شمار اکیسویں نمبر پر آتا ہے مگر حیرت ہے کہ موبائل کے استعمال میں ہم پانچویں نمبر پر ہیں۔ بچہ بچہ بلکہ بچی بچی موبائل سے کھیل رہی ہے۔ اس کی افادیت سے انکار نہیں مگر اس کا استعمال غلط ہو رہا ہے۔

ایسے ایک روز ایک چہکتی ہوئی اور وہ بھی زنانہ آواز ہمارے موبائل پر آئی۔

’’شاہد صاحب بول رہے ہیں۔۔۔؟‘‘

’’جی ہاں۔۔۔‘‘

’’آپ نے مجھے پہچانا؟؟؟‘‘

’’کیا آپ میری کوئی پرانی دوست ہیں۔۔۔؟؟؟‘‘

’’جی ہاں۔۔۔‘‘

’’کون۔۔۔؟؟‘‘

’’یہ نہیں بتاؤں گی، آپ خود پہچانئے!‘‘

’’آپ کی آواز بہت خوبصورت ہے، لگتا ہے حال ہی میں سنی بھی ہے مگر سمجھ نہیں آ رہا کہ آپ کون ہیں؟؟‘‘

’’کیا آپ مجھ سے ملنا چاہیں گے۔۔۔؟‘‘

’’کیوں نہیں۔۔۔کب کہاں؟‘‘

’’سنا ہے آپ کی بیگم بڑی سخت ہیں، انہیں پتہ چل گیا تو؟‘‘

’’ارے وہ تو اللہ میاں کی گائے ہیں اور میں بھی آج تک پکڑائی نہیں دیا ہوں۔ جلدی بتائیں، کہاں ملیں گی؟‘‘

’’آپ بتائیں۔۔۔؟‘‘

’’یوں کریں میریٹ ہوٹل آ جائیں۔۔۔ لیکن نہیں، وہاں کوئی دیکھ لے گا۔۔۔‘‘

’’تو دیکھ لے۔۔۔ پھر کیا ہوا؟؟؟‘‘

’’آپ ایسا کریں، شکرپڑیاں پارک میں ایک ٹی اسٹال ہے، آپ وہیں آ جائیں۔۔۔‘‘

’’اچھا جی۔۔۔ جلدی آیئے گا‘‘

ہم بھاگم بھاگ اس طرف روانہ ہوئے تو وہ ہم سے پہلے وہاں پہنچی ہوئی تھیں۔ ہم نے انہیں فوراً پہچان لیا، وہ بے غم کی سہیلی تھیں اور باقاعدہ مسکرا رہی تھیں۔ برابر میں ہماری بے غم ان کا وائس ریکارڈنگ والا فون تھامے بار بار ہماری گفتگو ری وائنڈ کر کر کے سن رہی تھیں۔ یوں کہہ لیں کہ سیانا ’’موبائلیہ‘‘ پھنس گیا تھا اور وہ بھی دونوں ٹانگوں سے۔۔۔ موبائل فون واقعی بیکار چیز ہے، ہم سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں کہ اب اسے ترک ہی کر دیا جائے۔

شاہد اطہر کا تعلق کراچی سے ہے لیکن سکونت اسلام آباد میں رکھتے ہیں۔ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازم ہیں۔ جوانی کے زمانے میں ’’پی ٹی وی‘‘ پر اداکاری کے جوہر بھی دکھا چکے ہیں۔ لاہور سے شائع ہونے والے طنز و مزاح پر مبنی رسالے ماہنامہ ’’چاند‘‘ کے مستقل لکھنے والوں میں شامل رہے ہیں۔ ان کے طنز و مزاح میں خاصی جدت اور تازگی ملتی ہے۔ موضوعات کا انتخاب خاصا نیا اور اچھوتا ہوا کرتا ہے۔

قسطوں قسط

پانچویں قسط

پانچ کروڑ لے لو!

حافظ مظفر محسن

فیمی ---آپ چپکے سے ایک کروڑ کیش لے کیسے آئی اور پھر اس پرانے کپڑے میں لیے باہر بھی نکل آئی ---ایسے تو مرد بھی نہیں کرتے؟ پھر یہ ایک کروڑ جہاں سے آپ نے انعامی بانڈ کیش کروایا وہاں تو مجھ جیسا بندہ بھی جائے تو سینکڑوں خونخوار آنکھیں گھورتی دکھائی دیتی ہیں وہ جگہ تو ویسے ہی جرائم پیشہ افراد کے حوالے سے بدنام ہے---وہیں شیش محل روڈ کا باؤ بشیر بھی تو بیٹھا کرتا تھا---میں نے اُسے خود ٹوٹی پھوٹی سائیکل پر آتے دیکھا---وہ دیوار کے ساتھ اپنی سائیکل زمین پر لٹا دیتا اور ایک پرانی دری بچھا کر زمین پر بیٹھ جاتا---میں نے اُس سے راہ و رسم بڑھائے تو وہ میرا آنا جانا دیکھ کر مجھ سے ''فری'' ہو گیا۔

''باؤ---پرچی بھی کھیلا کر؟'' اُس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

کھیلتا ہوں مگر آج کل پرچی ملتی نہیں---مدینہ کالونی کا گل خان بھی اب تو پرچی والا کام چھوڑ چکا ہے؟''

تو پھر---کسی دن تین بجے چلنا میں ہال روڈ والے حاجی سلیم سے تمہاری ''بات'' کروادوں گا؟''...... ''چپکے سے رازداری کے ساتھ''

''آج چلیں؟'' میں نے جلد بازی کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ---نہیں یار باؤ بدر---حاجی سلیم کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے اُس نے اپنے بھانجے معمر کو ساتھ رکھ لیا تھا پچھلے مہینے چالیس لاکھ والے پرائز بانڈ کی قرعہ اندازی تھی ''چاند رات'' کو معمر اپنے ماموں کا ایک کروڑ چالیس لاکھ روپے والا بیگ لے کر نکل گیا---کچھ دن بعد اُس نے حاجی سلیم کو انگلینڈ سے ''میل'' کر دی---''ماموں جان---آپ کے ایک کروڑ چالیس لاکھ لے کر میں تو نکل آیا---وہ پیسے میں نے لاہور کے کار ڈیلر ''بابا شاہ دین'' کے حوالے کیے، بابے نے کہا تھا کہ میں اس رقم کے بدلے تمہیں مہینے کا پانچ لاکھ منافع دیا کروں گا--- بابا شاہ دین بھی میرے یہ پیسے ہتھیا کر کہیں روپوش ہو گیا ہے---لہٰذا میں ڈرتا ہوا انگلینڈ آ گیا---یہاں مزدوری کروں گا اس طرح لاہور کے ''تھانوں میں جو پرچے'' مجھ پر ہوئے ہیں اُن سے بھی جان چھوٹ جائے گی اور آپ کی رقم بھی کبھی ادا کر دوں گا---سوری---ویری سوری۔''

کرنل مجید نے ایک دفعہ پطرس بخاری سے کہا"اگر آپ اپنے مضامین کا مجموعہ چھپوائیں تو اس کا نام"صحیح بخاری" رکھیں۔"
پطرس نے جواب دیا" اور اگر آپ اپنی نظموں کا مجموعہ چھپوائیں تو اس کا نام"کلام مجید" رکھیں۔"

"ایک کروڑ چالیس لاکھ لُٹ جانے کے باوجود بھی حاجی سلیم کا کام جاری ہے؟"۔۔۔میں نے حیرت سے پوچھا۔

باؤ بشیر نے ہنستے ہوئے سر ہلایا اور غصے سے بولا "بھولے بادشاہ۔۔۔ حاجی سلیم نے اس پرچی جوا سے لاہور میں تین پلازے کھڑے کر لیے ہیں، کروڑوں اس کے علاوہ ہیں۔"

میں سوچنے لگا، حاجی سلیم جو بظاہر سیدھا سادہ لگتا ہے اُس نے اس "پرچی جوا" سے کروڑوں کمائے، کروڑوں لاکھوں اُجاڑے، یہ باؤ بشیر کیا گل کھلائے گا۔

اس دوران فیمی کی ایک سبھلی مرسیڈیز میں پاس سے گزری۔

"بدر گاڑی موڑو۔۔۔ پروین جا رہی ہے۔"

"وہی انگلینڈ والی؟"میں نے پوچھا۔

تیز چلاؤ۔۔۔گاڑی۔۔۔ہاں ہاں وہی" وہ اچھلتے ہوئے بول رہی تھی۔ میں نے بھی خوب دوڑائی گاڑی مگر وہ بھی "لگتا ہے دوبئی میں ٹرالر چلاتی رہی ہے"۔۔۔میں نے مذاق میں کہا تو وہ ہنس دی اور غیر ارادی طور پر بولی"بدر، یہ حرامزادی بھی بہت تیز ہے بیس سال سے گرمیاں انگلینڈ میں گزارتی ہے اور سردیاں پاکستان میں۔۔۔ سیاسی لوگوں کو لوٹنے میں ماہر ہے۔" اقبال ٹاؤن میں اس کا پلازہ بھی ہے اور یہ اپنے گھر میں جوا بھی کرواتی ہے اور کبھی کبھی "مشاعرے" بھی۔

"حسین امتزاج ہے۔۔۔ جہاں جوا کھیلا جاتا ہے وہیں مشاعرہ بھی کبھی کبھار ہو جاتا ہے؟"

"اِس کے پیچھے بھی اس حرامزادی کی کوئی چال ہو گی کوئی چالاکی ہو گی؟"اُس نے ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے کہا۔

"پھر موڑ لوں بینک کی طرف" میں نے پوچھا تو بولیں۔
"آج موڈ خراب ہو گیا ہے چلو گھر چلیں۔۔۔ فضل حق سے"سری پائے" لیتے ہیں گھر چل کے کھائیں گے۔۔۔ کیونکہ میری ملازمہ "ریسٹ" پر گئی ہوئی ہے آج کل۔۔۔اور ہاں وہ باؤ بشیر والا قصہ سناؤ ناں"......؟!

"ہاں۔۔۔تو میں بتا رہا تھا؟"

اِس دوران اُس نے میرا فقرہ مکمل نہ ہونے دیا اور بولی "بدر تم قصے کہانیاں بڑے مزے لے لے کر دلچسپ انداز میں سناتے ہو، کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے تم "فلمیں چلاتے ہو" میرا دل لگانے کے لیے؟۔۔۔مگر میں عادی ہوں مجھے مزہ آتا ہے۔۔۔ تمہارے ان قصے کہانیوں کو سن کر!"

میں چپ کر گیا، ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

اُس نے میری بائیں ٹانگ پر چٹکی کاٹی "ہو گئے ناں ناراض؟ یہ پٹھان خون ناراض ہونے میں دیر نہیں لگاتا اور پتہ نہیں کب ناراض ہو جائے اور پھر کسی چھوٹی سی بات پر مان بھی جائے۔۔۔سوری" اُس نے تقریباً دس دفعہ"سوری" دہرایا اور میں نے گاڑی "فضل حق" کے باہر روک دی۔

"تمہیں ایک بات بتاؤں؟"

"ہاں ہاں" میں نے اثبات میں سر ہلایا......

"میں نے بہت سال پہلے کیپٹن وٹو کو وفاقی کالونی میں اُن کے گھر جا کر ہاتھ دکھایا تھا، اُس نے کہا تھا کہ تمہاری موت کسی حادثے میں ہو سکتی ہے اور ایسا ہی اشارہ مجھے کومل طارق نے بھی دیا تھا!"

"ہیں تو دونوں اپنے کام میں ماہر پھر تو آپ کو الرٹ رہنا چاہئے۔۔۔ پلیز احتیاط سے گاڑی چلایا کریں، کومل طارق بھی پامسٹری کو سمجھتی ہے لیکن کیپٹن وٹو تو باقاعدہ علم الاعداد کا ماہر بھی ہے اور نماز روزے کی تلقین بھی کرتا ہے مختلف اخبارات میں اُس کے کالم بھی چھپتے ہیں اور کمال کا سیاسی تجزیہ کرتا ہے یہ بندہ!"

"ہاں تو باؤ بشیر۔۔۔!"

ہاہا۔۔۔ ہاہا۔۔۔ میں ہنس دیا"مزہ آتا ہے اُس "پارٹی" کو لطیفہ سنانے کا جو ہنسنے کو تیار ہو اور واقعات یہ قصے کہانیاں دراصل میری آپ بیتیاں ہیں اور میں یہ سناتا ہوں صرف اُن لوگوں کو جو

ان سے سبق سیکھتے ہیں یا جوان کو صرف انجوائے کرتے ہیں۔ مجھے عادت نہیں اپنے الفاظ اپنے فقرے ضائع کرنے کی۔۔۔ میری ماں کہا کرتی تھی ''بدر پتر کسی کو آج کے دور میں نصیحت نہ کیا کرو۔ یہ ناشکرے لوگوں کا زمانہ ہے!'' تو میں بتا رہا تھا کہ باؤ بشیر ٹوٹی ہوئی سائیکل اور پھٹی پرانی دری پر آ گیا تھا مگر چند دن ''محنت'' سے سڑک کنارے گزارنے پر اُس نے پرائز بانڈز کے کام میں کافی نام بنایا، یہاں تک کہ اُس نے چند ماہ میں ''کرولا'' گاڑی خریدی۔ ڈرائیور بھی رکھ لیا اور تھرماس میں گھر سے بنوا کر قہوہ بھی لانے لگا۔''

''باؤ بشیر لگتا ہے دو چار بڑے نوٹ جمع کر لیے ہیں؟'' ایک دن میں نے مذاق مذاق میں کہا تو ہنس دیا اور آہستہ سے بولا ''بحریہ میں دو کنال کنال کے پلاٹ بھی لے لیے ہیں!''

''ایک مشورہ دوں۔۔۔ باؤ بشیر!''

''کیا کہا۔۔۔ جلدی بول۔۔۔؟'' اُس نے کان پاس کرتے ہوئے پوچھا۔

''باؤ بشیر یہ غیر محفوظ جگہ ہے، بہتر ہے تو یہاں سے اب چلا جا اور کسی اور کاروبار میں پیسہ لگا کر آرام و سکون کی زندگی گزار!''

''اوہ۔۔۔ بھولے شہزادے جو مزہ اس کام میں۔۔۔ جو چسکا یہاں لگنے والی دیہاڑی میں ہے وہ کہیں اور نہیں۔''

بات آئی گئی ہوگئی۔

ایک صبح اخبارات کے فرنٹ پیج پر باؤ بشیر کی تصویر کے ساتھ تین کالمی خبر چھپی تھی ''باؤ بشیر کو قتل کر دیا گیا۔ ڈاکو پیسہ اور پرائز بانڈز بھی لے جانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔''

ہوا یوں کہ بلال گنج بازار کے چوراہے میں ایک چھوٹے سے گھر کی اوپر والی منزل پر اُس کا گھر تھا۔ اُس کی صرف ایک ہی بیٹی تھی۔ باؤ بشیر صبح سویرے آواز لگائی ''زرینہ بیٹی بڑا پیکٹ پھینک۔'' اُس کی بیٹی نے پرائز بانڈز کا بڑا پیکٹ پھینکا جو اُس نے کیچ کیا اور گاڑی میں رکھ دیا۔ اُس نے پھر آواز لگائی ''زرینہ بیٹی چھوٹا پیکٹ پھینک!''

چھوٹا پیکٹ زرینہ نے پھینکا تو ڈاکو نے اُس کیچ کر لیا۔ اس دوران بشیر کے سکیورٹی گارڈ نے فائرنگ کی، اُدھر ڈاکو کے ساتھیوں نے بھی گولیاں چلا دیں۔۔۔ باؤ بشیر موقع پر ہی مارا گیا۔۔۔ اور کروڑوں روپے اور اکیلے زرینہ پیچھے چھوڑ گیا۔

ہم سری پائے کھا رہے تھے اور پاس ہی وہ ''نوٹ'' بھی پڑے تھے۔

''بدر تمہارا دل کبھی کیش دیکھ کے بے ایمان ہوا؟'' اُس نے لمبی ہڈی سے ''مغز'' نکالتے ہوئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے پوچھا۔

آپ کا کیا خیال ہے، مجھ میں ایسے جراثیم ہیں؟ نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔۔۔ تم جب بھی میرے گھر آئے کبھی خالی ہاتھ نہیں آئے۔۔۔ ہم نے لاہور پنڈی کے بیسیوں بڑے سے بڑے ہوٹلوں میں کھانے کھائے اکٹھے کئی کئی بار شاپنگ کی، تم نے اک بار بھی مجھے پیسے نہیں دینے دیئے۔۔۔ ہمیشہ لڑ جھگڑ کے ہر جگہ خود ہی ''پے منٹ'' ادا کی۔

اچانک زوردار دھماکے کی آواز آئی ''فائرنگ۔۔۔ کون ہو گا'' اُس نے اچانک بولا اور نہایت پھرتی سے 9MM کا پستول نکال کر بالکونی کی طرف بھاگی۔ موٹر سائیکل پر دولڑکے تھے جو گھر کے مین گیٹ پر فائر کر کے بھاگ نکلے۔ دروازے پر چار گولیوں کے نشان تھے میں شدید خوفزدہ تھا مگر وہ مطمئن۔

حافظ مظفر محسن صاحب کا تعلق لاہور سے ہے۔ میں بچپن سے ان کی کہانیاں اور نظمیں بچوں کے مختلف رسائل میں پڑھتا چلا آ رہا ہوں۔ بچوں کے ادب میں اِن کا حصہ قابلِ ستائش ہے۔ بہت اچھے شاعر اور کالم نگار ہیں۔ ان کے کالم ایک مؤقر اخبار میں ''طنز و مزاح'' کے عنوان سے مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ مزاح نگاری اِن کا خصوصی میدان ہے۔ طنز و مزاح پر مبنی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اِن کے اندازِ تحریر میں شگفتہ بیانی، بیساختگی اور ڈرامائی عناصر وافر پائے جاتے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے لئے بہت عرصہ سے لکھ رہے ہیں۔

قسطوں قسط

دوسری لڑی

قصہ چہار درویشنیں

شفیق زادہ

کہیں دل ملے کہیں دل جلے

ہم نے اپنے لڑکپن میں خالو کی جوانی دیکھی تھی۔ چھ فٹ سے بھی اُبھرتا ہوا قد، سلیقے سے سنورے ہوئے بال (جس کی ایک لٹ پیشانی پہ جھول کر اُن کے رومان پسند ہونے کا اشارہ دیتی) کھلتا ہوا گندمی رنگ اور کشادہ سینہ۔ چہرے پر مستقل چھائی معصومیت اور نرمی ایسی کہ کوئی بھی لڑکی دل ہار کے بھی جیت کی خوشی منانے میں فخر محسوس کرے۔ شاید ہی کوئی حسینہ اس بات سے واقف ہوگی کہ اِن کے چہرے پہ یہ نرم تاثرات کسی بھی خلافِ طبیعت بات پر ایسی کرختگی میں بدل جاتے کہ اگر گالی نہ بھی دیں تو مخالف کو اس کا احساس ضرور ہو جاتا۔ ہمارے ایک کرکٹر دوست نے بتایا کہ بولنگ کے دوران خالو کبھی ایمپائر سے اپیل نہیں کرتے، بس چہرے کے تاثرات تبدیل کر لیتے، باقی کام ایمپائر خود کر لیتا۔ بے چارہ ایسا نہ کرے تو بات نکلتی ہے، جو پھر دُور تلک جاتی ہے۔ اُن کی آواز ایسی پاٹ دار کہ آج بھی بہتیروں کو اُن سے فون پر بات مکمل کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ خالو کے اکثر کاروباری سودے صرف اس لیے ٹوٹ جاتے کہ دوسری پارٹی اُن کی آواز کی گھن گرج سے خوفزدہ ہو کر گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیتی۔ مگر اِسی آواز میں جب مہندی، شادی یا دوسری تقریبات میں مقصد یا بنا مقصد ایسے ہی موقع کی منتظر لڑکیوں سے دھیمی لے میں کلام کرتے تو بے چاریوں کو رات رات بھر نیند نہ آتی۔ کروٹیں بدلنے کی وجہ سے تکیے پر ٹوٹے بال دیکھ کر مائیں بیٹی کی جوانی میں ہی گنجی ہونے کے ڈر سے تل ملے سرسوں کے بدبودار تیل سے مالش شروع کر دیتیں۔ بعد میں اسکول یا کالج کا کام لینے کے بہانے ایک دوسرے کے گھر جا کر کمرہ بند کر کے دبی دبی آواز میں اپنے اپنے پوشیدہ جذبات سے

بے خبر خالو پر حق جتایا جاتا اور ایک دوسرے سے کٹی کی جاتی، جس کی وجہ جاننے کے لیے دونوں اطراف کی مائیں سر توڑ نا کام کوشش کرتیں اور یہ مان کر چپ ہو بیٹھتیں کہ اِس بار امتحان کچھ زیادہ ہی 'سخت' ہے۔ محلے کی لڑکیوں میں اُن کے کھوئے کھوئے لہجے، بکھرے بال، کھلے گریبان اور سجیلے پن کی دھوم تھی۔ وہ شادی شدہ، منگنی شدہ اور تازہ تازہ جوان شدہ اِن معاملات میں تھوڑی بہت شُد بُد رکھنے والیوں کے حلقے میں اپنی اپنی پسند کے فلمی ہیرو کے مطابق وحید مراد، ندیم اور محمد علی مشہور تھے۔ کچھ 'ایڈوانسڈ یوزرز' یعنی حقیقت پسند بیاہی خواتین اور اپنے سرکاری ملازم 'غیر فعال' شوہر کو 'نکھٹو بکارِ خاص' سمجھنے والیاں، آنکھیں موند کر سپنوں میں اِن میں 'سلطان راہی' کو بھی کھوجتی تھیں۔ محلے کے کسی نر کو اِن سے اُلجھنے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ بھولو برادران کے گارڈن والے اکھاڑے میں باقاعدگی سے زور کرنے اور بھری بھر کم ڈمبل اُٹھا کر کسرت کرنے جاتے تھے۔ اس سے بڑھ کر یہ حقیقت بھی کہ زنانہ نظروں کی تیر اندازی کو اُنھوں نے ہمیشہ نظر انداز کیا اور کبھی بھی اندرون یا بیرون محلّہ کسی کو نہ قریب آنے دیا اور نہ کسی کے قریب گئے، البتہ ہر کسی کے دُکھ سُکھ میں بوجھ اُٹھانے کے لیے اُن کے چوڑے اور مضبوط کاندھے سب سے پیش پیش ہوتے۔

جب اندرونِ صوبہ شورش شروع ہوئی تو کراچی کا رُخ اختیار کیا اور یہیں پر سسر صاحب سے اُن کی پہلی ملاقات ہوئی۔ کراچی جیسا بڑا شہر، جس کی ہر چیز خواب سے بھی بڑھ کر فسوں خیز تھی۔ اس شہر کی بڑی سڑکیں، بڑی عمارات، بڑے ہوٹل، بڑی دکانیں، بڑے لوگ اور اِن سب سے بڑھ کر بڑی بڑی خواہشات، جن کو پورا کرنے کے لیے بڑی بڑی دوڑیں اور پھر بڑی جیت، جس کے بعد بڑی بڑی دشمنیاں، جن کو نبھانے کے لیے چھوٹی سی زندگی۔ عجب گورکھ دھندا تھا یہ شہر، اندھی ممتا کی ماری ماں کے آنچل کی طرح سب کو سمیٹے ہوئے اتنا مہربان کہ محوِ خواب ہونے سے پہلے ہر پیٹ میں روٹی ضرور پہنچے۔ اور اتنا بے لوث کہ ہر اگلی صبح ناخلف مقیمین کے ہاتھوں مسترد ہونے کا دُکھ بھی سہے، مگر نہ شکوہ نہ

شکایت۔ دُکھ کے موسم اور بیگانگی کے عذاب سہنے کے باوجود کسی کھمبی کی مانند بڑھتا اور پھیلتا ہی چلا جا رہا ہے، ہر سائز کے بڑے اور کم ظرف کے احسان فراموشوں کے لیے۔ اپنی بڑی جاگیر کو جلد اَز جلد چھوٹا کرنے کی اَن چاہی خواہش اِن کو جلد ہی بلبل ہزار داستان اور ریس کورس تک لے گئی، جہاں پر وہ پیروں فقیروں کے گھوڑوں کے مقابلے پر بازی لگاتے اور بغیر کسی تعویذ کے جیت بھی جاتے۔

اُنھی دنوں حیدرآباد سے حال ہی میں نو وارد خالہ اوّل کی فیملی میں اِن کا عمل دخل شروع ہوا۔ پہلے پہل محلے کی پرچون کی دکان پر پھر سینما گھر اور بالآخر ریس کے میدان میں خالہ اوّل کے والد صاحب سے دوستی کی پینگیں بڑھائی گئیں۔ دونوں حضرات کی عمروں میں بھلے کافی فرق تھا، مگر شغل بہت مماثل تھے۔ بڑھ کر خرچ کرنے کے شوقین اور یہ شوقین پر خرچ کرنے والے۔ چند ہی مہینوں میں رفتہ رفتہ بڑے میاں اِن کے اتنے مقروض ہو گئے کہ

سرینگر کے ایک مشاعرے میں جب منتظمین نے بلراج کومل کو طے شدہ معاوضے ۲۰۰ روپے کے بجائے ۲۵۰ روپے دیے تو کومل نے حیران ہو کر پوچھا کہ یہ پچاس روپے زیادہ کس لئے دیئے جا رہے ہیں؟''
اس پر منتظمین میں سے ایک شخص بولا ''حضور! آپ ہوٹ بھی تو زیادہ ہوئے تھے۔''

خالو کا اُن کے گھر میں آنا جانا شروع ہو گیا۔ قرض کے اضافے کے ساتھ ساتھ گھر کے معاملات میں بھی اِن کو راہداری ملنی شروع ہوئی اور یہیں ایک روز کبوتروں کو جلا شیری کرتی، گنگناتی، ہانک لگاتی، تمتماتے گلابی گالوں اور گہری سیاہ آنکھوں والی سرو قد خالہ اوّلین اُن کے دل میں کُھب گئیں۔ موصوفہ بھی اِن کی ناموری اور کارناموں سے انجان نہیں تھی، شاید اسی لیے مقناطیسی کشش کی مانند اُن کی طرف کھنچی چلی آئیں۔ نظریں ملنے سے دل ملنے تک کا مرحلہ بڑی سرعت سے طے ہوا، مگر اس سے آگے کا مرحلہ پار کرنے کی ہمت دونوں ہی جوڑ نہیں پا رہے تھے۔ اس غیر مرئی تعلق کو دستاویز کی شکل دے کر قابلِ حمل بنانے کے لیے بڑھوؤ کی منظوری بہت ضروری تھی۔

بے وقوف کہتے ہیں کہ پیسہ بڑی شے ہے اور سیانے کہتے ہیں کہ پیسہ کچھ بھی نہیں، اور اِس معاملے میں بھی رواج کے مطابق سیانوں کو شکست ہوگئی۔ پیسہ نامی چالو جن نے یہ مشکل مرحلہ بھی دنی طے کروادیا اور نیب زدہ سیاسی لوٹوں کے ہڑپ کیے ہوئے قرضوں کی مانند بڑھوؤ کے تمام قرضے معاف ہوگئے۔ بڑھوؤ کے کاندھوں سے قرض اور فرض دونوں کا بار ختم ہو گیا، دخترِ نیک اختر بالآخر پرائی ہوئی۔ اور اِس طرح خالہ اوّلین اُن کی زندگی میں داخل اور دخیل ہوئیں۔ اِدھر بڑھوؤ اپنے بڑے پن کے عوض تا حیات مالی امداد کے حق دار ہوئے۔

اُن دونوں کی شادی بھی خوب تعلق ثابت ہوئی، بالکل آگ اور پیٹرول کی دوستی کی مانند، بھڑکتی کو بجھانے کی ہر کوشش مزید بھڑکنے کا سبب بن جاتی۔ دونوں نوجوان مہم جواز دواجی مہم جوئی کی پیاس کو نمک سے بجھانے کی کوشش کرتے، اِس سے بھلا پیاس کیا بجھتی، نا آسودگی اور بڑھ جاتی، مگر بادلوں کی طرح تیرتے ہنسوں کے اِس جوڑے کو پیاس بجھانے کی کوئی جلدی تھی بھی نہیں۔ خالہ اور خالو کی یہ جوڑی خوب شہرت حاصل کر رہی تھی۔ اب تو محلے سے باہر بھی دور تک خالو کی مردانہ وجاہت اور خالہ کی مسحور کن خوب صورتی کے قصے کیپٹل ٹاک کی طرح عام ہونے لگے تھے۔ موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر خالو سے چپک کر بیٹھی خالہ، جب کچی اور ٹوٹی سڑک پر اپنا توازن سنبھالنے کی کوشش میں خالو سے کچھ اور چپک جاتیں تو خالو کو موٹر سائیکل سنبھالنے اور دیکھنے والوں کو نظریں ہٹانے میں بہت دقت ہوتی۔ دونوں ہی سماج اور سماج کے ٹھیکیداروں کے جلنے بھننے کا خوب سامان کر رہے تھے۔ گہرے گریبانوں کا فیشن شریف زادیوں نے ابھی تک نہیں اپنایا تھا، لہٰذا چادر نما دوپٹے سے بدن کو ڈھانپ کر چہرے اور سر پر لپیٹنے کے بعد جو کچھ تھوڑا بہت عیاں ہوتا، نظر باز اُسی کو دیکھ کر سرد آہ بھر لیتے۔ استخوانی بدن والی ماڈلز ابھی رسالوں کے سرورق پر نمودار ہونا شروع نہ ہوئی تھیں اور بھرے بھرے جسم والی گسی گسائی خواتین خوب صورتی کا پیمانہ تھیں۔ اس حقیقت سے کسی کو تردّد نہ تھا کہ اِس پیمانے کے لحاظ سے خالہ اُس زمانے یا دور کا اسٹینڈرڈ پیس تھیں، جس کو ایک دل جلے کے بقول، پیرس کے اسٹینڈرڈ ہاؤس میں ٹمپریچر اینڈ اینوائرمنٹ کنٹرولڈ شوکیس میں ہونا چاہیے تھا، مطلب سماجی رشتوں کی چیرہ دستیوں اور شوہرانہ دست برد سے محفوظ۔ اتنا محفوظ کہ امتدادِ زمانہ بھی جسے چھو نہ سکے۔

شفیق زادہ کراچی کے ایک علم دوست گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ طنز و مزاح و فکشنل تھرلر کے دشت کے سیاح ہیں۔ قلم کو آنکس کی طرح استعمال کر کے ہنسانے اور رلانے کا فن جانتے ہیں۔ ان کی پہلوٹھی کی کتاب ''ہم تماشا'' فکاہیہ ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔ ''پیارے میاں'' کے کردار کے خالق شفیق زادہ روٹی، روزگار اور روزی یعنی بھابھی کے لیے پردیس میں بسے ہوئے ہیں۔ یقیناً وہ ''ارمغان ابتسام'' کے لئے ایک شاندار اضافہ ہیں۔

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

پڑی جو تجھ سے مجھے مار بھول جاتا ہوں
سبق یہ عشق کا ہر بار بھول جاتا ہوں

نکالتا ہوں میں پاؤں سے خار چُن چُن کر
کیا تھا کیسے مجھے خوار بھول جاتا ہوں

کہا پرندے نے میں اتنی ٹھونگیں مارتا ہوں
کہ ان کے صحن میں منقار بھول جاتا ہوں

تمہارا چال چلن سارا میرے سامنے ہے
نوشتہ برسرِ دیوار بھول جاتا ہوں

سجاتا سر پہ ہوں خلعت بڑے قرینے سے
پہن کے اُلٹی میں شلوار بھول جاتا ہوں

اچھل اُچھل کے میں بندر کی طرح منبر پر
وقارِ جُبہ و دستار بھول جاتا ہوں

لگا کے دام ہر اک شے کے اپنی مطلب کے
میں حُسنِ چشمِ خریدار بھول جاتا ہوں

ہوں کارِ عشق میں مشغول اس قدر شب و روز
کہاں پہ کی تھی کھڑی کار بھول جاتا ہوں

توقع اُن سے تو رکھتا ہوں ہر طرح کی مگر
کیا تھا میں نے بھی انکار بھول جاتا ہوں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

گرد و غبار لفظوں کا کافی کثیف ہے
شاعر ہے موٹا ، شعر نزار و نحیف ہے

فصلیں اگائے جائے غزل کی زمین پر
یہ سوچتا نہیں کہ ربیع ہے؟ خریف ہے؟

بے جوڑ ایک جوڑے کو دیکھا ہے باغ میں
چھوٹا سا قافیہ ہے تو لمبی ردیف ہے

میری غزل کو چھاپ دیا اپنے نام سے
ڈاکو ہے وہ کہ جس کا تخلص شریف ہے

بیوی کو گر نہ مار سکیں آنکھ ماریئے
ایمان کا یہ درجہ اگرچہ ضعیف ہے

اس ملک کا خدا ہی ہے حافظ عزیزِ من
منصف جہاں بکاؤ ہے حاکم بھی تھیف ہے

آیا بڑھاپا بھول گئے سارے چونچلے
لیلیٰ بنی عفیفہ ہے مجنوں عفیف ہے

بیماریاں اُڑاتا ہے ساری مذاق میں
مظہر کو دیکھو کیسا طبیبِ ظریف ہے

ڈاکٹر عزیز فیصل

سنا ہے زہر ملاتے ہیں وہ دوائی میں بھی
بنا رہے ہیں مساجد اسی کمائی میں بھی

یہی نہیں کہ سیانا ہے تایا جان فقط
کوئی تو ہوگی حماقت ذہین تائی میں بھی

شعوری طور پہ رکھتا ہے چور دروازہ
کہ بچ نکلنے کا رستہ ہو پارسائی میں بھی

ہمارے شہر سے استاد منتخب ہوتے
کوئی بھی دیتا ٹریننگ اگر ڈھٹائی میں بھی

وہ رہنما ہے تساہل پسند لوگوں کا
جو آئے دیر سے تقریبِ خودستائی میں بھی

زنانہ نام سے آیا ہے فیس بک پر تو
بجے گی کانچ کی چوڑی تری کلائی میں بھی

سخن کے بیچ تخیل کے نٹ نہ ڈھیلے ہوں
وہ رینچ لائی ہے بزمِ غزل سرائی میں بھی

ڈاکٹر عزیز فیصل

چرا کے جان تمنا کا ہار، آخر کار
غریب شخص بنا مالدار، آخر کار

لگا کے گھات سر راہ دن دہاڑے ہی
کسی نے وار کیا شعر وار، آخر کار

"وصال کھل گیا ہے" سننے کو اٹھارہ قیس
کھڑے ہیں کوچے میں باندھے قطار، آخر کار

ضرور ہتھے چڑھیں گے تری زنانی کے
خطوں میں درج وہ قول وقرار، آخر کار

خدا کا شکر، نظر آ گئی بشیراں کو
ہنسوڑ آنکھ کی یہ آبشار، آخر کار

تنویر پھولؔ

تیرے عاشق تو روتے رہیں گے
صحن اشکوں سے دھوتے رہیں گے

تیرے ابا نے اُن سب کو پکڑا
حادثے ایسے ہوتے رہیں گے

پھوڑنی ہیں رقیبوں کی آنکھیں
فصل مرچوں کی بوتے رہیں گے

رَت جگا شاعروں کی ہے قسمت
دوپہر میں بھی سوتے رہیں گے

شیخ جی ساتھ شیخانی کے ہیں
مُنّا ، مُنّی تو روتے رہیں گے

تجھ سے اُس کا ملن غیر ممکن
ساتھ کھوتی کے ، کھوتے رہیں گے

ہو رہی ہے اذانِ سحر بھی
شیخ جی خوب سوتے رہیں گے

توند کا حجم کم کرلو ، ورنہ
انگلیاں ہم چبھوتے رہیں گے

سارے لیڈر بنے پھولؔ! ''نَل'' ہیں
خوں سے ماتھا بھگوتے رہیں گے

تنویر پھولؔ

تاک میں ہم ہیں اِک زمانے سے
پھانستا ہے اُسے بہانے سے

تین دن اُس کو بند رکھا تھا !
اب وہ ڈرتا یہاں ہے آنے سے

تیر پھینکا تھا بھینگی آنکھوں سے
وہ خطا ہو گیا نشانے سے

اپنے ڈیڈی کا احترام کرو
باز آجاؤ گانا گانے سے

تم تو ''چیٹر'' ہو، فائدہ کیا ہے
اپنا دُکھڑا تمھیں سُنانے سے

اُس کی زلفوں میں جوئیں ہیں کالی
آؤ ! ان کو نکالیں شانے سے

بندروں کی طرح اُچھلتا ہے
رند نکلا شراب خانے سے

اُس کی مکاری اِک حقیقت ہے
فائدہ کیا ہے آزمانے سے

پھولؔ ! آخر وہ بن گیا شاعر
غسل خانے میں گنگنانے سے

نوؔر جمشید پوری

رعب جب اپنا جمانا بھی ضروری ٹھہرا
کر کے احسان جتانا بھی ضروری ٹھہرا

کر دیا سردی نے جب دوستو! جینا مشکل
لکڑیاں لا کے جلانا بھی ضروری ٹھہرا

دیکھ کر بجلی کا بل، شام سے مٹی کے دیئے
بلب کے بدلے جلانا بھی ضروری ٹھہرا

شان جھوٹی ہی سہی سب کو دکھانے کے لئے
دوست کچھ گھر پہ بلانا بھی ضروری ٹھہرا

جیب ہے خالی مگر آ گیا دعوت نامہ
اب نیا سوٹ سلانا بھی ضروری ٹھرا

اتنے پیسوں میں ہوا جب سے گزارہ مشکل
خرچ میک اپ کا گھٹانا بھی ضروری ٹھہرا

بڑھ رہے غم کے پریشر کو گھٹانے کے لئے
بزم میں آ کے ہنسانا بھی ضروری ٹھہرا

دیکھ کر رشتوں میں ظلمت کا گھنیرا سایہ
نوؔر کو دل میں بسانا بھی ضروری ٹھہرا

نوؔر جمشید پوری

محفل میں آج دیکھئے جلوہ جناب کا
قصہ سنانے بیٹھے ہیں اپنے شباب کا

مدت سے جیسے بھوکا ہو، کھاتا چلا گیا
منہ سے لگا جو ذائقہ اُس کو کباب کا

پایا پھر اُس نے خود کو گٹر میں پڑا ہوا
پوری طرح سے اُترا نشہ جب شراب کا

ملنے جو اُن سے وہ بھری برسات میں گیا
چہرے پہ رنگ آ گیا ڈھل کے خصاب کا

کچی گلی سے لب پہ تبسم کو دیکھ کر
کیسے کھلا ہے دیکھئے چہرہ جناب کا

قرباں تھے جس پہ، دیکھ کے بے ہوش ہو گئے
پردہ اُلٹ کے دیکھا جو اُس نے نقاب کا

کرنا پڑے نہ یاد سبق نوؔر اس لئے
صفحہ ہی پھاڑ دیتی تھی وہ تو کتاب کا

عرفان قادر

بندروں کو نہ کبھی ایسے چڑانا ہرگز
سلفیاں لیتے ہوئے مُنہ نہ بنانا ہرگز

روز اک اور نیا روگ لگا ہے چونکہ
یاد رکھتے ہی نہیں عشق پُرانا ہرگز

گولڈ میڈل نہیں سُستی کا وگرنہ مِلنا
ہے قسم تجھ کو کہ مت ہاتھ ہلانا ہرگز

میڈیا خواہ بڑا زور لگا لے اِس پہ
جھوٹ کا پیڑ نہیں ہو گا توانا ہرگز

ووٹ اپنا کسی حقدار کو دینا اِس بار
حکمراں بن نہ سکے پھر وہ گھرانہ ہرگز

عقدِ ثانی سے ڈراتے ہیں بڑے لوگ مگر
ایسے لوگوں کی تُو باتوں میں نہ آنا ہرگز

کیسے بچ پاؤ گے تم واں کی حسیناؤں سے
جانا غلطی سے بھی مت بوٹسوانا ہرگز

شعر گوئی کا مرض اور بھی بڑھ جاتا ہے
ساتھ امرود کے کھاؤ نہ "بنانا" ہرگز

میرا اندازِ تکلم ہے بہت سوں سے جُدا
بھائی! سمجھو نہ اسے مولویانہ ہرگز

عرفان قادر

ہمیں پتا ہے کہ کنجوس اور کیا دے گا!
اگر دیا بھی تو کینو گلا سڑا دے گا!

ستارے توڑ کے لانے کے مت کرو دعوے
کرو گے کیا؟ وہ اگر لا کے چھالیا دے گا

مری غزل کو کہے گا وہ بحر سے خارج
سبق عروض کا آ کر بچونگڑا دے گا

عوام فُول بنے گی الیکشنوں کے دنوں
کہ جو بھی آئے گا لیڈر، ڈھکوسلا دے گا

جنابِ قیس نے ٹھیلا لگا لیا آخر
فقط پچاس رُپے کا شوارما دے گا

ہے اپنے پاؤں پہ چلنا کٹھن، مٹاپے سے
عدو فرار کرانے میں آشنا دے گا

امیدِ گفٹ کی ہرگز بجن سے مت رکھنا
کہ ایک رائی کا دانہ نہ بھک منگا دے گا

دبا کے کان میں اُنگلی سبھی نکل لیں گے
سخن ور اپنی ہی آمد کا خود پتا دے گا

وہ مارکیٹ میں لے آئیں گے غزل نثری
ابھی اُنھیں نہ ہدایت اگر خدا دے گا

نوید صدیقی

چھوڑ کر ہاتھ شاعری ہوگی
"یہ روایت بھی اب نئی ہو گی"

تیس سالوں سے ہم ہیں ناکارہ
جانے کب کارکردگی ہو گی

ریٹ رشوت کا کم نہیں کرنا
کم ہوا تو زیادتی ہو گی

ایک دوجے کو داد دیں گے ہم
یوں بھی امدادِ باہمی ہو گی

"نیب" کی پھرتیوں پہ مت جانا
چار دن کی یہ چاندنی ہو گی

آگئی گر، رپورٹ میرے خلاف
پھر سے سب انکوائری ہو گی

شادیاں چار چار اور اک ساتھ
دیکھئے صاف خودکشی ہوگی

شوق افسر کو ہے خوشامد کا
اب تو دفتر میں "جی جی جی" ہو گی

نوید صدیقی

آئیں سمجھ تو مجھ کو بھی سمجھا دے کالیا
جائیں گے کس طرف کو یہ حالاتِ حالیہ

کی افسرانِ بالا نے امدادِ باہمی
باہر سے جو بھی فنڈ ملا ، مل کے کھالیا

تعریف میں نے بھولے سے ہمسائی کی جو کی
زوجہ نے آسمان ہی سر پر اُٹھا لیا

بڑھیا ہے پر نمایاں ہے دوشیزگان میں
میک اپ نے ماہ وسال کو ایسے چھپا لیا

سردی سے کپکپائے چلا جارہا ہے وہ
میں نے کہا تھا مت نہا سالے، نہا لیا

نایاب تھا حلال لحم ، مارکیٹ میں
پالک میں ہم نے ڈال کے آلو پکا لیا

کاجل بھی تھی فرح بھی تھی پیشِ نظر مگر
"دل کو نگاہِ ناز نے اپنا بنا لیا"

دنیا میں اب تو شخص وہی کامیاب ہے
جس نے نوید قرض لیا اور دبا لیا

منیر انور

چوتھے عقد پہ دھیان لگائے بیٹھا ہوں
سینے پر عمران لگائے بیٹھا ہوں

سگریٹ نوشی چھوڑ کے اس کی خواہش پر
پتی والا پان لگائے بیٹھا ہوں

بسکٹ، ٹافی، نمکو، پاپڑ اور سگریٹ
کھوکھے پر سامان لگائے بیٹھا ہوں

واک وہ کرنے آتی ہے اِس رستے پر
چاول، چھولے، نان لگائے بیٹھا ہوں

میرا پاگل ہونا عین سعادت ہے
نام کے آگے ''خان'' لگائے بیٹھا ہوں

وہ مجھ سے بکرے کا خواہاں ہے انور
اور میں اونٹ کی ران لگائے بیٹھا ہوں

دلشاد نسیم

تم شادی شدہ ہو یہ بتا کیوں نہیں دیتے
درد اپنے مری جان سنا کیوں نہیں دیتے

ملتا ہے جو ہر روز ہمیں ایک نیا غم
شیشے کے کسی کش میں اُڑا کیوں نہیں دیتے

ایسا نہ ہو لے ڈوبے تجھے تیرا بھروسہ
سیل اپنے کو تم لاک لگا کیوں نہیں دیتے

جس راز کو رکھنے سے بدہضمی سی ہو جائے
وہ راز ''بشیراں'' کو بتا کیوں نہیں دیتے

قربانی کا بکرا ہے یا دولہا ہے بلّی کا
کمزور بہت ہے یہ غذا کیوں نہیں دیتے

ہاشم علی خان ہمدمؔ

دال دلیہ کمال ہے مرشد
تھوڑا اوپر کا مال ہے مرشد

زن مریدی کا پوچھتے کیا ہو؟
کتنا مشکل سوال ہے مرشد

دیکھنے میں تو خوش نما ہیں پھل
کاٹئے جس کو لال ہے مرشد

دل کی خواہش ہے دوسری مرغی
گھر کی مرغی تو دال ہے مرشد

آئینہ اب دکھاؤں میں کس کو
نقش الٹا خیال ہے مرشد

وقت ملنے پہ گا بھی سکتا ہے
پختہ شاعر قوال ہے مرشد

جس کو مجھ پر حرام کہتا ہے
شیخ جی پر حلال ہے مرشد

اپنی پیری میں لیجیے دسواں
آخری نونہال ہے مرشد

نیل پالش کا نقش ہے یا پھر
آئینے میں ہی بال ہے مرشد

نام رکھا ہے جس کا این جی او
چند پریوں کا جال ہے مرشد

جو بھی کہنا ہے آج کھل کے کہو
مفت پیکج پہ کال ہے مرشد

فیک لوگوں کی داد سے پر ہے
فیس بکیے کی وال ہے مرشد

کتنا سوشل ہے وہ سٹیٹس میں
گھر میں جیسا بھی حال ہے مرشد

زود گوئی سے تنگ ہے ہمدمؔ
چار غزلہ مثال ہے مرشد

جہانگیر نایابؔ

نالے کو چاہیے کچھ وقت گٹر ہونے تک
"کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک"

"ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن"
باپ بن جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

رنگ لا کر ہی رہے گی یہ خوشامد اِک دن
تم مناتے رہو ماموں کو سُسر ہونے تک

سن بیالس میں کیا تھا کوئی وعدہ تم نے
منتظر ہوں میں عمارت کے کھنڈر ہونے تک

لال پیلا ہو، گلابی ہو کہ دھانی جاناں
"دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک"

جلوۂ حسن ترا عام ہے گرچہ سب پر
میں بھی ہوں صف میں،عنایت کی نظر ہونے تک

پری چہرہ ہو کوئی یا کوئی بھتنی نایابؔ
شمع ہر رنگ میں ملتی ہے سحر ہونے تک

شاہین فصیح ربانی

مرا مکان غریبی کے لالہ زار میں ہے
ترا فلیٹ کسی اجنبی دیار میں ہے

نہیں کچھ اور میسر تو میزبانِ من
نکال دیجیے لیموں اگر اچار میں ہے

کہ آپ لوگ عیادت کو آ نکلتے ہیں
یہ فائدہ تو مرے دوستو بخار میں ہے

جو کار میں تھا وہ پیدل دکھائی دیتا ہے
کبھی جو شخص تھا پیدل، وہ آج کار میں ہے

پڑھانا پڑتی ہے بچوں کو اپنے اے بی سی
بقا ہماری اگرچہ الف انار میں ہے

دکھا رہی ہے حسینہ جو اپنے دانت بہت
اسے بتاؤ وہ ریزر کے اشتہار میں ہے

نہیں ہے جان ہی میرے مقدمے میں فصیح
مرا وکیل کسی دوسرے شکار میں ہے

شاہین فصیح ربانی

بات یہ کوئی بزرگ اپن کو ٹولڈ
مرد کو چاندی بھلی، عورت کو گولڈ

لب نہ ہو جائیں کہیں اس کے فریز
اس قدر اس شخص کا لہجہ ہے کولڈ

ہمسری ہو بلغ کی اس کو نصیب
یعنی پہلی بال پر ہو جائے بولڈ

جانے کس سے ہو رہی ہے اسکی بات
کر رکھی ہے اس نے میری کال ہولڈ

نسلِ نو کی ڈگریاں آئیں نہ کام
تجربے کے بل پہ ٹھہرے اولڈ گولڈ

اس نے پوچھا، کس کو لو لیٹر لکھا
کر رہے تھے ہم یونہی کاغذ کو فولڈ

منسلک ہے تو روایت سے فصیح
شعر تیرے اس لیے لگتے ہیں اولڈ

مرزا عاصی اختر

ہمیں منظور ہوتے جا رہے ہو
تبھی مغرور ہوتے جا رہے ہو

ہر اک تھانے میں فوٹو ہے تمھارا
"بہت مشہور ہوتے جا رہے ہو"

جسے دیکھو تمھیں سے چھیڑ خانی
تو کیا دستور ہوتے جا رہے ہو

ذرا سا "ٹھرا" تم نے کیا پیا ہے
"نشے میں چور ہوتے جا رہے ہو"

ہمیں خارش کی بیماری نہیں
جو ہم سے دور ہوتے جا رہے ہو

دکھائی دے گیا ہے قرض خواہ کیا
جو یوں مستور ہوتے جا رہے ہو

سبھی کے منہ میں پانی آ گیا ہے
تو کیا انگور ہو تے جا رہے ہو

وزیر چند روزہ بن کے عاصیؔ
"بہت مغرور ہوتے جا رہے ہو"

روبینہ شاہین بیناؔ

فیس بکیوں نے ایسا تماشا کیا
فیک چہرہ دکھایا تماشا کیا
بونگیاں اپنی سب ٹیگ کرتے گئے
وال پر سب نے اپنا تماشا کیا
تین زوجاؤں کے ہاتھوں آخر پٹا
جس نے شادی کا چوتھا تماشا کیا
یہ سیاست بھی تو اک عجب کھیل ہے
لیڈروں نے بھی کیا کیا تماشا کیا
یوں بجاتے گئے ڈگڈگی راہبر
بندروں کو نچایا تماشا کیا
کبھی چانٹا جڑا اور کبھی تھپکی دی
زندگی نے بھی اچھا تماشا کیا
روکنے والے بس روک کر رہ گئے
کرنے والوں نے ہر جا تماشا کیا
بات کچھ بھی نہ تھی پر گلے پڑ گئی
جوک ہم نے کیا، کیا تماشا کیا
مقتدر لوگ بھی بازی گر تھے عجب
چار سالوں میں خاصا تماشا کیا
گرچہ منصف نے حق پہ دیا فیصلہ
اس پہ شرفا نے کیا کیا تماشا کیا
کبھی غالب کو رگڑا تو کبھی میر کو
ہم نے شعروں میں بیناؔ تماشا کیا

محمد خلیل الرحمٰن خلیلؔ

جندل تو ہنس کے گر پڑا للکار دیکھ کر
خاتون پہلوانوں کی یلغار دیکھ کر

وہ ڈیٹ پر جو آ گئی ابّا کی کار میں
فوراً سے پہلے چل دیئے ہم کار دیکھ کر

بیگم ملی ''ضرورتِ رشتہ'' کی ایڈ سے
پچھتا رہا ہے یار ''وہ'' اخبار دیکھ کر

مغرور تھا پٹھان جو مِنّت پہ آ گیا
بنّوں کی میرے ہاتھ میں نسوار دیکھ کر

جلدی سلام پھیر دیا مولوی نے آج
حلوے کی دیگ سے اڑی مہکار دیکھ کر

ہنس ہنس کے ہم نے کمرہ ہی سر پر اٹھا لیا
''مومو'' کا اک ڈرامے میں کردار دیکھ کر

اپنی سہاگ رات کو مولی سے جا ملا
رنگِ سیہ میں بھوت سا دلدار دیکھ کر

غربت زدہ امیر کا کشکول چھن گیا
روتا پھرے یہ گنج کا بازار دیکھ کر

بیگم ملی خلیلؔ کو مت پوچھیے حضور!
اِک ہوک دل سے اٹھتی ہے اغیار دیکھ کر

محمد خلیل الرحمٰن خلیلؔ

وار جب سر پہ جارحانہ ہوا
ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

پیار جب تم سے مخلصانہ ہوا
بس یہی فعل مجرمانہ ہوا

مار ڈالے مجھے نہ اب خوشبو
پرفیوم اس کا ہے قاتلانہ ہوا

میں پڑوسن سے پانی لیتا تھا
پھر محبت ہی آبیانہ ہوا

سیلفیوں میں چرا لیا ہے اسے
کام ہم سے یہ بزدلانہ ہوا

شوخ رنگوں کا پیرہن پہنے
دوست اپنا لگے زنانہ ہوا

اب تو بیگم کی سنتا رہتا ہوں
بات اپنی کہے زمانہ ہوا

ہر سہولت ملے سیاست میں
جیل گویا ہے آستانہ ہوا

آ گئی گھر سہیلیاں اس کی
لو مرا پھر کچن ٹھکانہ ہوا

کون سنتا ہے بات شوہر کی
ذہن سب کا ہے خادمانہ ہوا

گھر کی بجلی کا کٹ گیا میٹر
بل بشیراں سے جب ادا نہ ہوا

حور دل میں بسائے بیٹھا ہے
جس کا سسرال پیر خانہ ہوا

ایک بڑھیا گرا گئی بجلی
دل یہ بوڑھے کا عاشقانہ ہوا

داد اس شعر کی ملی ہے خلیلؔ
جس میں کچھ ٹھیک قافیہ نہ ہوا

گوہر رحمٰن گہرؔ مردانوی

جب میری نگاہیں ہوئی دوچار اچانک
بن جانا پڑا عشق کا بیمار اچانک

ہم نے جو کیا پیار کا اظہار اچانک
رخسار ہوا یار کا گلنار اچانک

حیران و پریشان، سمجھنے سے بھی قاصر
تھپڑ سے گرم ہو گیا رخسار اچانک

ایک اس کا رویہ بھی سمجھ میں نہیں آتا
ہتھے سے اکھڑ جاتا ہے جب یار اچانک

دیکھا جو پری وش کو تو غدار ہوا دل
یوں ہوگیا جانم سے ہمیں پیار اچانک

جب اس کے تکبر کو نمٹنے نہیں پائے
غصے سے نکالی ہے یہ نسوار اچانک

اس نے بھری محفل میں مری خوب خبر لی
گوہرؔ کی بڑھی خون کی رفتار اچانک

گوہر رحمٰن گہرؔ مردانوی

گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے
جان بچی سو لاکھوں پائے

توں توں میں میں ہو جائے
چاہے چور بھی شور مچائے

میری بلی مجھ کو میاؤں
ایویں دور کی کوڑی لائے

مرچ مسالہ کوئی لگا کر
تگنی کا کیوں؟ ناچ نچائے

دال نہیں گلنی اب تیری
بیل منڈھے چڑھ ہی نہ جائے

دو برتن ٹکرا جاتے ہیں
جھانسے میں پھر کیوں کر آئے

جیسے کرنی ویسے بھرنی
نہیں ہے اس میں دو دو رائے

جھوٹ بولے تو کوا کاٹے
بیگم ہے بھگوان کی گائے

گوہر جھگڑے مول نہ لے کر
سازش موت اپنی مر جائے

اقبال شانہ

میں حالِ زار اُس کو سنانے سے رہ گیا
اور وہ مرا مذاق اُڑانے سے رہ گیا

وہ مال و زر زمین کمانے سے رہ گیا
شانہ بچارا شعر سنانے سے رہ گیا

آنے میں رہ گیا کبھی جانے سے رہ گیا
چکر تری گلی کے لگانے سے رہ گیا

اعلانِ جنگ ہو گیا جب شہر میں جناب
ہتھیار ڈال کر میں زنانے سے رہ گیا

جانے تمام ہو گئی کب عید کی نماز
غافل مزے سے "پانی نہاتے" سے رہ گیا

ڈولی میں بیٹھ کر وہ کبھی کے چلے گئے
سہرہ میں سر سے باندھ کے آنے میں رہ گیا

جانے کسی نے لوٹ لیا کب مشاعرہ
فدوی تو سامعین ہنسانے سے رہ گیا

ملین ریال سے کوئی آگے نہیں بڑھا
یہ درد میرے دام لگانے سے رہ گیا

یہ داستان، عشق کا انجام ہو گیا
کردار میرا صرف فسانے سے رہ گیا

وہ سو گیا تھا تان کے شانہ شبِ وصال
میں ساری رات اُس کو جگانے سے رہ گیا

سیّد فہیم الدین

بہت حسّاس ہونا چاہیے تھا
تمھیں تو ساس ہونا چاہیے تھا

ہمارا دل یہیں پر کھو گیا ہے
تمھارے پاس ہونا چاہیے تھا

ہماری بد دعائیں لگ رہی ہیں
تمھارا ناس ہونا چاہیے تھا

یہ موسم ہے کرپشن کا خصوصی
تمھیں یہ راس ہونا چاہیے تھا

جہنم میں بہت نزدیک اپنے
ہمارا باس ہونا چاہیے تھا

ہیں کتنی دیر سے ہم بھی کنوارے
تمھیں احساس ہونا چاہیے تھا

سنا ہے تم بھی کھانے پر گئے تھے
ڈنر میں گھاس ہونا چاہیے تھا

نوید ظفر کیانی

بھارت کا جاسوس ہے سو ہے دشمن وہ
لیکن جو ہیں ہم تم میں کلبھوشن ۔۔۔وہ؟

ہتھیاروں کی سپلائی میں آگے ہیں
اور دیتے ہیں امن و اماں کے بھاشن وہ

اہلِ وطن کی سادہ لوحی پر شاوا
بن جاتے ہیں آپ ہی اپنے دشمن وہ

شاہینوں کے نام پہ دھوکہ کھاتے ہیں
سونپتے ہیں کرگس کو نظمِ گلشن وہ

چکھنے والے "اخ تھو، اخ تھو" کرتے ہیں
لگتا تھا کیا دودھ ملائی مکھن وہ

منہ پر اُن کا پرنٹ نہ لے کر آ جائے
جن ہاتھوں میں دیکھ رہا ہے ابٹن وہ

دانت نہ پیسو یونہی اپنے بچوں پر
یاد کرو ناں تم بھی اپنا بچپن ۔۔۔وہ

پیار محبت کی باتیں بھی کرتا ہے
گچی سے بھی پکڑے ہوئے ہے گردن وہ

اوروں پر تو انگلی فٹ سے اُٹھتی ہے
لیکن پہلے دیکھیں اپنا دامن وہ

عالم عصرِ نو ہیں، خوب بناتے ہیں
دین و دنیا گھوٹ کے اپنا چورن وہ

جن کے اپنے دانت ہوئے مفرور ظفر
بیچ رہے ہیں آج بسوں میں منجن وہ

نوید ظفر کیانی

ہر چشمِ خریدار کو درکار تماشا
بن جائے اگر گرمئ بازار تماشا

پانی نہیں آتا ہے مگر رہتا ہے ہردم
سپلائی کے نلکوں میں ہوادار تماشا

یہ امرِ مسلم ہے، تماشائی ہے دنیا
یا جنتا تماشا ہے یا سرکار تماشا

فیشن میں گرفتار کبھی یہ ہے کبھی وہ
گلنار تماشا کبھی گلزار تماشا

گل خان ہمہ وقت ہی "پشتون زدہ" کیوں؟
جب بارہ بجے بنتا ہے سردار تماشا

کٹ پتلی بنے پھرتے ہیں ہم اہلِ زمانہ
رکھتا ہے بپا درہم و دینار تماشا

لیڈر ہیں کہ جیسے کہیں بے چھتا بھڑیں ہوں
ہے ڈیموکریسی بھی مزیدار تماشا

شلواروں میں پتلون خجل سی نظر آئے
پتلونوں میں بن جاتی ہے شلوار تماشا

اغیار کی تہذیب کے جب بُت ہوں دلوں میں
بن جائیں نہ کیوں اپنی ہی اقدار تماشا

ہو جاتے ہیں بے مایہ وہاں لعل و گہر بھی
کرتی ہو جہاں چشمِ خریدار تماشا

جو چشمۂ تاریک تعصب کا چڑھا لے
بن جاتا ہے وہ دیدۂ بیدار تماشا

جو لوگ "ہڑپو" ہیں، جہاں میں ہیں ظفر مند
رہ جاتا ہے بن کر یہاں حقدار تماشا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

شعبۂ بے ہوشی و رفعِ درد

جب ہم پہلے پہل ڈاکٹر بنے تو ہمیں سب سے زیادہ خوش نصیب اور سکھی ڈاکٹر بے ہوشی والے ڈاکٹر ہی نظر آئے۔ کہاں شعبۂ اطفال کے بے انتہا مصروف شب و روز اور کہاں مزے سے نقاب اوڑھے آپریشن تھیٹر کے ایک کونے میں ایک مشین کے ساتھ کرسی پر براجمان شعبۂ بے ہوشی کے ڈاکٹر صاحب، جنھیں نہ کوئی راستے میں روک کر اپنے مسئلے بتاتا ہے، نہ کوئی رپورٹس چیک کراتا ہے اور نہ ہر چھوٹی موٹی بیماری پر خاندان والے بار بار موبائل فون سے نشتر زنی کرتے ہیں اور نہ ہی بہت سے لوگ انھیں ڈاکٹر ہی سمجھتے ہیں۔ اب جب کہ رفعِ درد کو بھی اِس شعبے کے ساتھ نتھی کر دیا گیا ہے ان ڈاکٹروں کو بھی مریضوں سے شرفِ ملاقات کے وافر موقع اور سہولیات میسر آ رہی ہیں۔

آپریشن تھیٹر

یہ وہ جائے مخصوصہ ہے کہ جہاں ہائے ہائے کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا کہ اہلِ خانہ دوست اور رشتہ دار سب مریض کو ڈاکٹروں کے رحم و کرم پہ چھوڑ کر آنکھوں سے اوجھل ہو چکے ہوتے ہیں۔ نقاب پوش سرجن اپنے ہتھیاروں سے لیس ہو کر جب نو وارد مریض کے سامنے نمودار ہوتا ہے تو ایسے ڈراونے مناظر اردو انگریزی مکس کے اس دور میں بقول "انور مسعود" اُن بیان ایبل" ہو جاتے ہیں۔

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں\
مریضِ سرجری یکدم لگا تھا چلانے\
یہ ڈاکٹر ہیں کہ ڈاکو تمیز مشکل ہے\
"نقاب پوش پھریں ہیں پہن کے دستانے"

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

آپریشن تھیٹر والوں کی اپنی ایک الگ ہی دنیا ہوتی ہے۔ تمام ہسپتال سے عمومی طور پر کٹ کر ان کی زندگی ایمرجنسی، اور آپریشن تھیٹر کے درمیان بھاگتے دوڑتے گزر جاتی ہے اور کبھی کبھی یہی جگہ جائے امن و سکون بھی ٹھہرتی ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب دنیا کے بکھیڑوں سے تنگ آ کر آرام و سکون تلاش کرنے امتیاز احمد تاج کے "چچا چھکن" کی طرح دفتر کی جگہ آپریشن تھیٹر پہنچ جاتے ہیں

جا کے تھیٹر میں لیا کرتے ہیں خراٹے وہ\
جب بہو ساس کا جھگڑا نہیں دیکھا جاتا

رؤوف رحیم

ماہرِ بے ہوشی

ماہرِ بے ہوشی اور سرجنوں میں ازل سے دشمنی چلی آ رہی ہے ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرانے کا عمل شروع سے جاری ہے صاحبانِ بے ہوشی کا موقف ہے کہ وہ مریضانِ سرجری کے زندگی سے موت اور موت سے واپسی کے سفر کے دوران ہر لمحے جیتے اور مرتے ہیں اور اس قدر شدید ذہنی دباؤ کے باوجود نہ صرف مناسب معاوضے کے حقدار ٹھہرتے ہیں اور نہ ہی ان کی شہرت میں اضافہ ہوتا ہے کہ مریض کا براہ راست ان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہاں اگر کوئی مسئلہ ہو جائے تو اُن پر سارا ملبہ ڈال دیا جاتا ہے۔ اِسی باہمی چپقلش کو ڈاکٹر مظہر یوں موضوعِ سخن بناتے ہیں

نشتر کو اک جانب رکھ کر سرجن نکلا یہ کہہ کر
کاٹا پیٹی ہم نے کر دی اب سب کام تمہارا ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

مکمل سرجری تو ہو گئی ہے
کہا سرجن نے چائے نوش کر کے
اینیستھیٹسٹ کو پرمت جگانا
ابھی سویا ہے ٹک بے ہوش کر کے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

اجازت نامہ

ہمارے یہاں ہسپتالوں میں یہ عام رواج ہے کہ آپریشن سے پہلے مریض یا اس کے لواحقین سے ایک اجازت نامے کا فارم بھروا لیا جاتا ہے۔ جس پہ کچھ اس قسم کی تحریر ہوتی ہے کہ ''میں اپنے مریض کا کسی بھی ڈاکٹر سے کسی بھی قسم کا آپریشن کسی بھی قسم کے اینیز تھیزیا سے کروانے کی اجازت دیتا/دیتی ہوں'' ہمارے عوام اپنے حقوق سے اس قدر بے خبر ہیں کہ اکثر وہ بغیر پڑھے ہی اس پہ دستخط کر کے آئندہ کے لئے اپنے آپ کو بے دست و پا کر لیتے ہیں ۔یہ قطعہ اسی قسم کی صورتحال کو واضح کر رہا ہے۔

وہ فارم لے گئے ہیں ہم سے آج بھروا کر
کریں وہ جیسے بھی بے ہوش ، کوئی چارہ نہیں
کچھ اس طرح سے ہوئے ہیں اسیر اب ان کے
ہمارا اپنی ہی جاں پہ بھی کچھ اجارہ نہیں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ادویاتِ بے ہوشی

ادویاتِ بے ہوشی میں اکبر الہٰ آبادی کے دور کی کلوروفارم سے لے کر موجودہ دور کی نائیٹرس آکسائیڈ کا ذکر بھی مزاحیہ شاعری میں نظر آتا ہے مگر سلمان گیلانی اس سے بھی آگے نکل جاتے ہیں ۔

قتل سے پہلے ہی کلوروفارم
شکر ہے ان کی مہربانی کا

اکبرالہٰ آبادی

بے ہوش کرنے کی ایک گیس کا نام نائیٹرس آکسائیڈ ہے جس کو laughing gas بھی کہا جاتا ہے کہ مریض اس کو سونگھ کر سرور وانبساط کا لطف اٹھاتے ہوئے درد کی شدت بھول جاتا ہے اور مزے سے بے ہوش بھی ہوجاتا ہے۔

قہقہے سے ہے بہتر نہ کوئی دوا
راز ہم پر ہنسی ہی ہنسی میں کھلا
گر ظریفانہ اشعار او۔ٹی میں ہوں
شاعری use ہو" نائیٹرس" کی جگہ

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

بے ہشی کا کیا مریض پہ کل
تجربہ کامیاب چپ کرکے
رکھ دی سرجن نے ناک پر اس کی
اپنی میلی جراب چپ کرکے

سید سلمان گیلانی

بے ہوشی (نظم)

دے کے ہم کو دوائے بے ہوشی
وہ اُڑھائیں ردائے بے ہوشی
زندہ رہ کر بھی اب نہیں زندہ
ساکنِ خوابنائے بے ہوشی
کام سارا دِکھا گیا موزہ
کون سونگھے دوائے بے ہوشی
"نائیٹرس" لے کے آگئے ہیں وہ
یوں ہمیں اب ہنسائے بے ہوشی
یہ سِلنڈر میں ہے جو "ہیلوتھین"
اصل میں ہے ہوائے بے ہوشی
پی کے مدہوش ہو نہیں سکتے
نہیں قدغن برائے بے ہوشی
کام پل بھر میں نازنینوں کے
سب کرائے ادائے بے ہوشی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

لوکل اینیستھیزیا

انگریزی میں لوکل اینیستھیزیا ایک طبی اصطلاح ہے جس سے مراد مریض کو آپریشن کے لئے پوری طرح بے ہوش کرنے کے بجائے صرف اس حصہ کو سن یا بے حس کرنا ہے جس کا آپریشن کرنا مقصود ہو جبکہ عام انگریزی میں لوکل سے مراد مقامی ہوتا ہے۔اس قطعہ میں ان دو زبانوں کے معانی سے استفادہ کیا گیا ہے۔

کہا میں نے وزیرِ باخبر سے
یہ اینیستھیزیا "لوکل" دیا ہے
وہ بولے ہے دوا باہر کی مہنگی
یہ تم نے ڈاکٹر اچھا کیا ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

سرجن اور آپریشن

آپریشن تھیٹر کی رونقیں سرجن کے بغیر تو ہو ہی نہیں سکتیں۔سرجن اور اس کے راز و نیاز سے یا خدا واقف ہوتا ہے یا اس کا مریض۔سرجن مریض کو کرب سے نجات دلا کر مسرت وشادمانی سے ہمکنار کرتا ہے۔

آپریشن کر نہیں سکتا ہر ایک
نسخہ لکھ دینا اگرچہ عام ہے

حوصلے اور صبر کا ہے امتحاں
سرجری کرنا جری کا کام ہے

ڈاکٹر مظہر عباس

یوں بجٹ کرنے لگا ہے ہم عوام الناس سے
آپریشن کر رہا ہو جیسے سرجن ہائے ہائے

نوید ظفر کیانی

ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اس لئے خدا ترس سرجنوں کے ساتھ ساتھ کچھ کالی بھیڑیں بھی اس شعبے میں آ کر ڈاکٹروں کا امیج خراب کرتی ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں اگر آپ کو یوں لگے کہ یہ تمام ڈاکٹروں کے خلاف لکھا جا رہا ہے تو کچھ درست نہ ہوگا۔ بات دراصل یہ ہے کہ برائی کی نشاندھی کرتے ہوئے لوگوں کو دراصل برے لوگوں سے متنبہ کیا جاتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں پھیلے ہوئے ہیں اور صرف ڈاکٹروں تک محدود نہیں۔ کوئی بھی شعبہ بذاتِ خود خراب نہیں ہوتا یہ افراد شعبہ ہوتے ہیں جو اسے برا یا اچھا بناتے ہیں۔ تفننِ طبع کے لئے
کچھ قطعات پیشِ خدمت ہیں۔

اک ڈاکٹر نے دوسرے سرجن سے یہ کہا
بہت بروقت ہی یہ اپریشن ہم نے کر ڈالا
گزر جاتے کہیں دو چار دن بھی اور ایسے ہی
یقیں کیجئے کہ یہ کمبخت خود ہی ٹھیک ہو جاتا

مرزا عابد عباس

کہا مریض نے سرجن سے بعد آپریشن
رسولی نکلی تو کیوں پیٹ اور پھول گیا
لگا کے قہقہہ بولا یہ ڈاکٹر کہ درست
میں اپنا تولیہ اس پیٹ میں ہوں بھول گیا

سلمان گیلانی

آپریشن تو کرے پیٹ میں کچھ بھول نہ جائے
ڈاکٹر کے سب ہی اوزار نظر میں رکھنا

نسیم سحر

لیکن ایک دفعہ یوں بھی ہوا کہ مریض کے ہوش میں آتے ہی سرجن نے اسے یہ بری خبر سنائی کہ جناب دوران آپریشن میرے دستانے آپ کے پیٹ میں رہ گئے ہیں لہٰذا مجھے دوبارہ انہیں نکالنے کے لئے ایک چھوٹا سا آپریشن کرنا پڑے گا۔ جس پر مریض گڑگڑا کر بولا جناب میری جان بخشی کر دیں۔ آپ دستانوں کے پیسے میرے بل میں ڈال دیجئے اور ان سے اپنے لئے نئے دستانے خرید لیجئے!

چوری چکاری

چوری چکاری بڑھ گئی ہے اس قدر یہاں
دل کرتا رہتا ہے ہمیں دھڑکن سے ہوشیار
تھیٹر پہ اب لگایئے پہرہ پولیس کا
گردہ اڑا نہ لے کوئی سرجن سے ہوشیار

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

زخمِ جگر تو چند منٹ میں ہی سی دیا
سرجن نے دیر کی مرا گردہ چرانے میں

سرفراز شاہد

ہندوستان کے مشہور مزاحیہ شاعر جناب اقبال شانہ کہ جو خود بھی میڈیکل کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں اور بطور ریڈیوگرافر کام کرتے رہے ہیں، ہسپتال کے ماحول سے بخوبی واقف ہیں۔ آپریشن کے بارے میں وہ اس طرح رقم طراز ہوتے ہیں

آپریشن (نظم)

ہو تن کا آپریشن یا من کا آپریشن
بیمار سے ہو پہلے سرجن کا آپریشن

عشاق کو ہمارا ہے مشورہ کرالیں
ٹوٹے ہوئے دلوں کے بندھن کا آپریشن
بیمارِ عشق ہرگز زندہ نہیں بچے گا
وہ کررہے ہیں دل کی دھڑکن کا آپریشن
سلجھائیں ان کے کیسے بکھرے ہوئے وہ گیسو
درپیش ہے غضب کی الجھن کا آپریشن
جانے ٹرین اتنی کیوں لیٹ ہوگئی ہے
شائد کہ ہو رہا ہو انجن کا آپریشن
اب کے برس اگر وہ پردیس سے نہ آئے
کردوں گی دیکھ لینا ساون کا آپریشن
اولا ناخلف ہو بیگم خفا خفا ہے
بیکار ہوگیا ہے جیون کا آپریشن
منزل تمہیں کہے گی خوش آمدید شانہ
تم کرسکو گے جس دم رہزن کا اپریشن

اقبال شانہ

آئی سی یو

اگرچہ آج کل یہ شعبہ ایک الحاقی شعبے کے سبب ہر شعبہ کا اپنا علیحدہ ہوتا ہے جیسے سرجیکل آ سی یو، میڈیکل آئی سی یو وغیرہ اسی طرح شعبہء بے ہوشی کا بھی اپنا ایک آئی سی یو ہوتا ہے جہاں آپریشن کے بعد بیہوش مریض کو کچھ عرصے رکھا جاتا ہے خصوصاً اُن مریضوں کو جن میں کچھ پیچیدگیاں ہوجاتی ہیں ۔

ڈاکٹر پہلے دیکھیں گے سسٹرز کو
آئی سی یو کے بیمار اپنی جگہ

عنایت علی خان

آئی۔سی۔یو

ہم جاں بہ لب ہیں لیکن آتا نہیں ہے کوئی
عرصہ گزر گیا ہے اور تب سے ہم یہیں ہیں
مظہر کہاں ہیں سارے اربابِ آئی سی یو
کہتے ہیں "آئی سی یو" اور دیکھتے نہیں ہیں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

مار ڈال

ٹیکوں سے جسم کرتا ہے چھلنی مسا و صبح
"ترسا نہ مجھ کو کھینچ کے تلوار مار ڈال"
مجھ کو نہ "آئی۔سی۔یو" میں ہلکان کر عبث
"گر مار ڈالنا ہے تو اک بار مار ڈال"

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

شعبۂ رفعِ درد

درد کو تین حرفی مختصر سا لفظ ہے مگر اس کے تاثر کو بیان کرنے کے لئے انسائکلو پیڈیا بریٹینکا جیسی ضخیم کتاب بھی کم پڑ جائے۔ اگرچہ درد کی اقسام میں بہت تنوع ہے مگر اس لفظ کی ابتدا و انتہا میں اتنی یکسانیت ہے کہ حرف "د" سے شروع ہوکر "د" پر ہی ختم ہوجاتا ہے۔ اردو شاعری میں دردِ دل سے لے کر دردِ جگر تک ہر منزل پہ شعراء اس درد میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ یوں کہا جائے کہ اردو شاعری درد کی آماجگاہ ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ بقول امیر مینائی ۔

جان پر صدمہ، جگر میں درد، دل کا حال زار
گھر کا گھر بیمار کس کس کے پرستاروں میں ہوں

ساغر صدیقی یہ الزام اپنے سر لیتے ہوئے خود کہتے ہیں ۔

فقیہہِ شہر نے تہمت لگائی ساغر پر
یہ شخص درد کی دولت کو عام کرتا ہے

اِس کے برعکس ڈاکٹر کو مسیحا اس لئے ہی کہا گیا ہے کہ وہ درد کے درمان کی تلاش میں اپنے آرام وسکون کو بھی مریض پر نثار کردیتا ہے۔ بیدم شاہ وارثی نے شائد ڈاکٹروں کے لئے ہی کہا تھا ۔

تم جو چاہو تو مرے درد کا درماں ہو جائے
ورنہ مشکل ہے کہ مشکل مری آساں ہوجائے

لیکن ڈاکٹر عزیز فیصل، ہرچند کہ ڈاکٹر ہیں مگر نہیں ہیں (وہ پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہیں) کا تجربہ اس سلسلے میں کافی تلخ اور ناخوشگوار دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کی تائید نیاز سواتی بھی کرتے ہیں ۔

اس نے زنبور سے کھینچی جو غلط داڑھ مری
''روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی''

ڈاکٹر عزیز فیصل

تھا مرض کچھ مگر دوا کچھ اور
اسلئے درد بڑھ گیا کچھ اور

نیاز سواتی

مریض درد

جس سے احساس غم ہی مٹ جائے
کوئی ایسی دوا پلا دیجئے
کوئی ٹیکہ قرار و تسکیں کا
آہ مجذوب کو لگا دیجئے

مجذوب چشتی

پین کلر

اب چارہ گر بھی پین کلر دے تو کون سا
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

سرفراز شاہد

دردِ دل تجھ سے کہوں کیا ناصح!
تو کوئی پین کلر بھی تو نہیں

نوید ظفر کیانی

ماہرِ درد

بعض اوقات درد کی تشخیص واقعی بہت مشکل ہوجاتی ہے۔ ایک دفعہ ایک مریض درد سے کراہتے ہوئے ڈاکٹر صاحب سے یوں گویا ہوا ''ڈاکٹر صاحب میرے پیٹ میں یہاں درد ہے'' پھر وہی انگلی سینے پہ لگا کر کہنے لگا اور یہاں بھی شدید درد ہے۔ اس طرح جسم کے مختلف مقامات پر وہ انگلی لگا لگا کر درد کی نشاندہی کرتا رہا ڈاکٹر بہت حیران تھا کہ ایسی پیچیدہ بیماری اور یک ہی وقت میں اتنی جگہ درد؟ اسے کچھ سمجھ نہ آیا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد آخر وہ بولا دراصل آپ کو ہر جگہ درد نہیں ہو رہا بلکہ حقیقت میں آپکی یہ انگلی فریکچر ہوگئی ہے۔

درد کے ماہر نے کیسے درد کو زائل کیا
آ بتاؤں راز تجھ کو کھول اپنے کان سُن
درد نے زحمت دوائی کی اُٹھائی ہی نہیں
فیس نے ہی رکھ دیئے تھے کر کے جسم و جان سُن

ڈاکٹر مظہر عباس

Pain Clinic

شدّتِ درد سے رو کر کہا میں نے مظہر
زندہ رہنے سے تو بہتر تھا فنا ہوجانا

مرے چلّانے پہ بے ہوشی کے ماہر بولے
"درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا"

ڈاکٹر مظہر عباس

تحریر ہے یہ نقلی طبیبوں کے گیٹ پر
ہوگا علاج دردِ جگر ہاف ریٹ پر

ہر فن لکھنوی

درد کی اقسام

اردو ادب میں دردِ دل سے بات شروع ہوتی ہے تو دردِ جگر تک با آسانی پہنچ جاتی ہے۔ سنجیدہ شاعری میں عاشق نامراد اپنی مراد نہ پوری ہونے تک دردِ محبت میں مبتلا رہتا ہے جب کہ مزاحیہ شاعری میں یہ مراد پوری ہونے کے بعد شوہر بامراد دردِ محبت کے علاوہ ہر قسم کے درد کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس درد کے مزے لے لے کر شعر گوئی شروع کر دیتا ہے۔

جگر میں درد ہو دل میں کہ دانت میں یارو
مزہ نہ آئے کبھی تھوڑی ہائے ہائے بغیر

نسیم سحر

اور پھر بیچارے شوہر کو درد کا تعین کرنے میں اس قدر دشواری ہو جاتی ہے کہ وہ اکثر اوقات یہ ہی نہیں بتا سکتا کہ۔

جگر سے پھیپھڑے سے دل سے یا کہ گردے سے
کہاں سے اٹھتا ہے درد نہاں نہیں معلوم

ظریف جبلپوری

دبانا دبانا مری پنڈلیوں کو
کہ ان میں ہے سوزِ جگر مام دینا

امام دین گجراتی

دردِ سر

سائینس دان ابھی تک اس بات کی تحقیق میں کامیاب نہیں ہوئے کہ سر درد پہلے پیدا ہوا کہ بیوی۔ کیونکہ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور کوئی شادی شدہ مرد اس سے مبرا نظر نہیں آتا

مجھے ہو گیا کہ تُو کتنا بڑا ہے ماہرِ درد
ہے ڈگری تیری کوئی غیر مُلکی یا دیسی
رفع کرے جو مرا درد تب تجھے مانوں
وہ دردِ سر کہ جو دیتی ہے رات دن بیوی

ڈاکٹر مظہر عباس

کارگر سیریڈون seridone ہوتی نہیں
"آخر اس درد کی دوا کیا ہے"

جوہر سیوانی

ڈاکٹر گر تیرے نسخے میں اثر موجود ہے
پھر سبب کیا ہے ابھی تک دردِ سر موجود ہے

نیاز سواتی

فکرِ نیل و کاشغر رکھتا ہوں میں
کتنا لمبا دردِ سر رکھتا ہوں میں

امیر الاسلام ہاشمی

علاج درد کی جملہ دوائیں ساتھ لاؤں گا
اگر ڈرتے ہو بعد وصل ہوگا دردِ سر پیدا

سگار لکھنوی

اس آستانِ حسن سے کیا فیض ہو جہاں
سر کو جھکائیے تو صلہ دردِ سر ملے

شوکت جمال

یہ دردِ سر جو میرے ہونے لگا
وہ کسی طور سے رفع نہ ہوا
چلو اچھا ہوا کہ آئے تم

”درد منت کش دوا نہ ہوا“

شان حیدر بیباک امروہوی

یہ تم نے کیسی دوا دی تھی ڈاکٹر صاحب
شکم کا درد گیا اب ہے درد سر صاحب

شبنم کارواری

کچھ ایسے بھی اب ڈاکٹر دیکھتے ہیں
کہ دردِ شکم ہو تو سر دیکھتے ہیں

نامعلوم

دردِ شقیقہ

آدھے سر کے درد کو دردِ شقیقہ بھی کہا جاتا ہے جو کبھی کبھی اس درجہ شدید ہو جاتا ہے کہ شقاوت اس کے آگے پانی بھرتی نظر آتی ہے۔ڈاکٹر مظہر اپنی کتاب ہسپتالی شاعری میں اسے ”دردِ شقی کا“ کہتے ہوئے لکھتے ہیں۔

رُخ زرد ہے، اُلٹی ہے، پھٹا جاتا ہے سر بھی
سر درد بہت دیکھے نہ دیکھا یہ طریقہ
معشوق کے سب ظلم بھلا دیتا ہے یکسر
جب ہوتا ہے مظہر کبھی یہ ”دردِ شقی کا“

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

نہ میری آنکھ نہ قلب و جگر میں رہتا ہے
وہ درد بن کے مرے آدھے سر میں رہتا ہے

پھل آگروی

دردِ کمر

جوانانِ محبت کے جگر میں درد ہوتا ہے
مگر شادی شدہ لوگوں کے سر میں درد ہوتا ہے
بڑھاپے کا مگر دردِ محبت بھی نرالا ہے
خیالِ کوئے جاناں سے کمر میں درد ہوتا ہے

طٰہٰ خان

جب مجھے دردِ کمر یاد آیا
ان کی مالش کا ہنر یاد آیا

اقبال فردوسی

اب تک گئی نہیں ہے عنائت کمر کی چک
حالانکہ ناز اٹھائے زمانے گزر گئے

عنائت علی خان

شاگرد کی کمر کا کڑا کا نکل گیا
استاد تیرے شعر کا مصرع اٹھانے میں

سرفراز شاہد

شیطانیوں میں کیا ہے مزا ہم سے پوچھئے
کس طرح گھیرتی ہے قضا ہم سے پوچھئے
اب تک کمر کے درد سے پیچھا نہیں چھٹا
عورت کو چھیڑنے کی سزا ہم سے پوچھئے

امیر الاسلام ہاشمی

بوجھ رشوت کا اُٹھایا اس قدر
پڑگئی چک ٹل گئی صاحب کی ناف

عظیم عباسی

نہیں جاتا کمر کا درد تب سے
کہ جب سے مہر مہنگائی نے دابا

لیفٹننٹ کرنل محمد خالد خان مہر

حقیقت ہے اداکاری نہ سمجھو
بیاں کو میرے سرکاری نہ سمجھو
کمر مہنگائی نے توڑی ہے میری
اسے مہروں کی بیماری نہ سمجھو

ڈاکٹر مظہر عباس

بارہ سو فوم کے گدے میں گئے
ہے وہی دردِ کمر کی صورت

مرزا عاصی اختر

درکار ہے کمر کو کوئی اور سانحہ
مہنگائی سے تو اپنی کمر ٹوٹتی نہیں

ضمیر جعفری

وہ کہتے ہیں غزل پڑھ دو میں کہتا ہوں کہ پیسے دو
سب یہ ہے کہ مہنگائی سے پاگل ہوگیا ہوں میں

کمر جھکنے لگی ہے مشقِ پروازِ تخیل سے
کمرشل دیکھ کے اپنی ''کمرشل'' ہوگیا ہوں میں

خالد عرفان

بنا کر زندگی کی ہر اِک شے کو تجارت
سمجھتا تھا کہ مشکل مری حل ہوگئی ہے
نمودِ ظاہری کا مگر ہے بوجھ اتنا
''کمرشل'' ہوتے ہوتے کمر شل ہوگئی ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

دردِ عرق النسا

دردِ عرق اُلنساء یا ''شیاٹکا'' ایک عام بیماری ہے جس میں کمر کے مہروں کی درمیانی جگہ کم ہونے کے باعث حرام مغز سے نکلنے والی نسوں پر دباؤ بڑھ جاتا ہے اوراس طرح کمر سے نکلنے والا یہ درد پیروں تک جاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ دردِ عرق النساء میں شامل نساء کا لفظ کبھی کبھی بہت بڑے مغالطے کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ ایک مرتبہ جب ہم نے ایک نستعلیق مریض کے کے درد کی تشخیص کرتے ہوئے اس مرض کا بتایا تو وہ چونک کر بولا ڈاکٹر صاحب میں مرد ہوں مجھے یہ عورتوں والی بیماری کیسے لگ گئی۔ لیکن زیرِ نظر نظم میں اس نام کی کوئی اور ہی وجہِ تسمیہ بتائی گئی ہے۔

کر کے معائنہ وہ بڑے انہماک سے
کہنے لگے کہ درد یہ عِرق اُلنساء کا ہے
ہم نے کہا کہ مرد ہیں بالکل اصیل ہم
تشخیص میں نہاں کوئی نکتہ خطا کا ہے
فرمایا ہنس کے ''نیوروفزیشن'' نے ہم سے یہ
بھائی مرض کے نام میں گھپلا بلا کا ہے
اس کا ''شیاٹکا'' ہے لقب میڈیکل میں پر
کہتے ہیں پیر جی کہ مرض یہ ''ہوا'' کا ہے
پوچھے اگر حکیم سے کوئی مرض کا نام
فرمائیں گے وہ درد یہ عِرق اُلنساء کا ہے
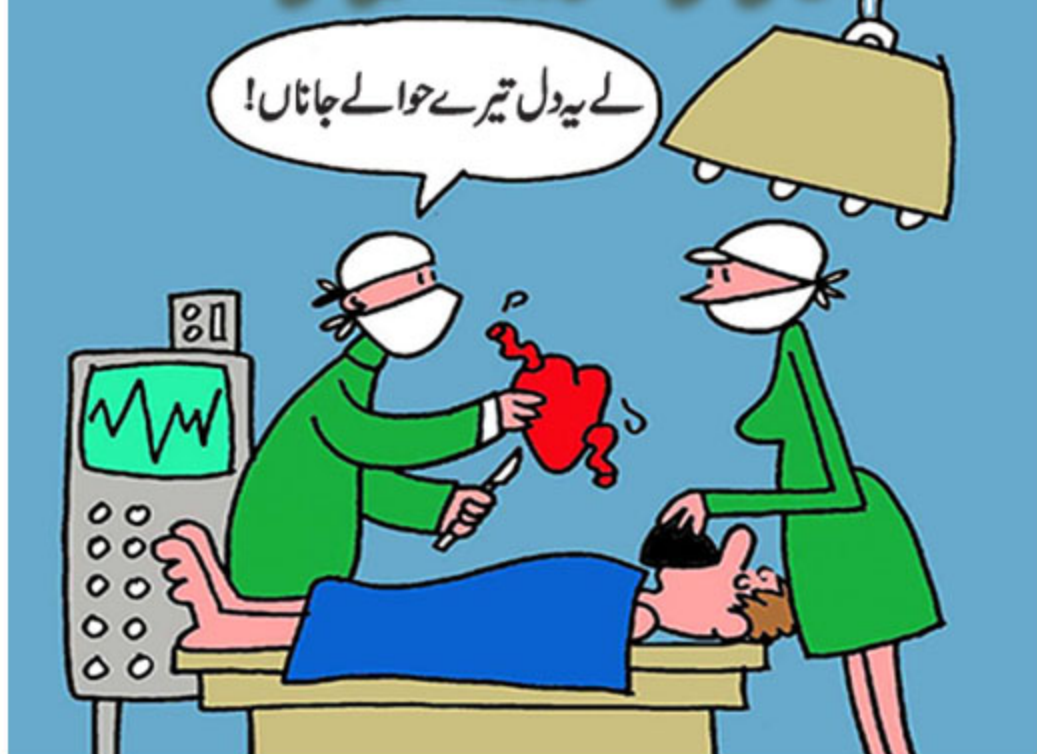
نسبت ہوئی ہے اس کو جو عورت کے نام سے
شائد یہ قصہ شدتِ جور و جفا کا ہے
جیسا کہ درد ہوتا ہے بیوی کی مار سے
ویسا ہی درد اصل میں عِرق اُلنساء کا ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

کیا خبر تھی، وہ کمرے جیسی کمر
دردِ عرق النساء بھی رکھتی ہے

نوید ظفر کیانی

کمر میں تیری ہو عرق النسا کا درد ایسا
مرے قریب ہی بیٹھی رہے اٹھا نہ کرے

خالد عرفان

عرق النسا کا نسخہ مہر النسا نے لکھا
نسخے میں کیا لکھا تھا یہ عرض پھر کروں گا

امیر الاسلام ہاشمی

دردِ دل

یقیں نہ، ہو تو قسم لے لو ٹرینکوالیزر کی
خبر نہ تھی کہ معالج بھی دل جلا ہو گا
جفا کے زخم سلاتا ہوں ہسپتال میں ہوں
بچھڑ کے مجھ سے مگر تو نے کیا کیا ہوگا

مجذوب چشتی

درد دل وہ ہے کہ جس کا ڈاکٹر ملتا نہیں
اس پہ طرہ بعد مردن نوحہ گر ملتا نہیں
میں تو اس بلقیس وش کو بھیجوں شادی کا پیام
کیا کروں ہدہد سا کوئی نامہ بر ملتا نہیں

آزر عسکری

میں درد محبت سے تڑپتا ہوں شب و روز
تم کہتے ہو مجھ کو کوئی بیماری نہیں ہے
اک تجربہ ہر روز کیا کرتے ہو مجھ پر
اے چارہ گرو دل میرا سرکاری نہیں ہے

طٰہٰ خان

دردِ دل کے لئے مسیحا نے
گولیاں دی ہیں دردِ سر والی

سرفراز شاہد

ہارٹ پیشنٹ نے ڈاکٹر سے کہا
میں نہ آتا تمھارے پاس کبھی
کیا کروں پر کہ بیٹھے بیٹھے ہی
''دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی''

انعام الحق جاوید

دل مرا اللہ نے ٹھیکے پہ بنوایا نہیں
روگ پھر یہ کس طرح چمٹا ہے میری جان کو
ہنس کے فرمانے لگے اک ماہر امراض قلب
''درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو''

مجذوب چشتی

دل کی بیماری کے اک ماہر سے پوچھا میں نے کل
یہ مرض لگتا ہے کیونکر آدمی کی جان کو
ڈاکٹر صاحب نے فرمایا توقف کے بغیر
''دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو''

انور مسعود

پالا رقیب سے جو ترے گھر میں پڑ گیا
جو دل کا درد تھا وہ مرے سر میں پڑ گیا

نوید ظفر کیانی

''دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو''
کوئی اس میں مبتلا ہے کوئی اس کا ڈاکٹر

شوکت جمال

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی اسلام آباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ طبی حوالے سے مزاحیہ شاعری انہیں کی اختراع ہے۔ اِن کے طنز و مزاح پر مبنی نصف درجن سے زیادہ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ طنز و مزاح نگاری کے ساتھ ساتھ نہایت شستہ و شگفتہ شاعری کے مرتکب بھی ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے اولین ساتھیوں میں شامل ہیں۔

شفیق زادہ

تاریک سے ایک سبق

بیرم خان اکبر کا اتالیق تھا، جس نے اس کی پرورش کی تھی اور تخت تک پہنچایا تھا۔ اکبر نے تخت پر بیٹھنے کے بعد جب سارے اختیارات قبضے میں کر لئے تو سوچا پہلے اس محسن کے احسانات کا بدلہ چکانا چاہیے۔ چنانچہ احسان کو ٹھکانے لگانے کے لیے بیرم خاں کو بلایا اور کہا ''خان بابا، اب آپ جایئے حج کر آیئے۔''

کسی کو حج پر بھیجنا خواہ وہ جانا چاہے یا نہ جانے چاہے، نیکی کا کام ہے۔ اکبر نے اور بھی کئی لوگوں کو اُن کے نہ نہ، نو نو کرتے ہوئے حج و زیارات پر بھیجا لیکن ناگزیر وجوہات اور چند مصروفیات کی وجہ سے خود کبھی نہ جاسکا۔

بیرم خاں بیچارہ حج کو جاتے ہوئے راستے میں قتل ہو گیا، تاریخ میں تو ایسا ہی لکھا ہے لیکن یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا کہ قتل ہو کہ کرامات کرے۔ اس نے سوچ سمجھ کر قتل ہونا قبول کیا ہوگا۔ اگر بچ جاتا تو اس حال میں ہوتا کہ جینا ایک کرامت ہوتی۔

اکبر کو اس کے مرنے کی خبر ہوئی تو بہت رنج ہوا، ضرور ہوا ہوگا ورنہ دوسروں کو شک ہو جاتا۔ ہماری کیا مجال کہ ہم بعد کے واقعات پر روشنی ڈالیں مگر تاریخ کا کسی نے کیا بگاڑ لینا ہے۔ سو وہ بتاتی ہے کہ بیرام خان کی موت کے بعد بیوہ آف بیرم، بیوی آف اکبر بن گئی اور بیرم کا بیٹا بلکتے بڑھتے بڑا ہو کر نو رتنوں میں شامل ہوا، جسے ہم اور آپ ماسوائے بیرم خان کے عبدالرحیم خان خاناں کے نام سے جانتے ہیں۔

بات رنج کی تو ہے مگر بات ہے رسوائی کی کہ اتالیق شاگردی کی توقع پر پورا نہ اتر سکا، قبر میں اتر گیا۔ دونوں صورتوں میں اسے نیچے ہونا ہی تھا۔ مگر اکبر کو یقیناً یہ اطمینان ہوا ہوگا کہ جب وہ استاد کا

گیم بجا سکتا ہے تو پھر کسی کی بھی ٹارگٹ کلنگ کر سکتا ہے۔ آنے والے دنوں میں اس کی عملی تفسیر انارکلی کی بربادی کی صورت میں ایک بازار بنا جو آج بھی آباد ہے۔

مزیدار بات یہ ہے کہ، تاریخ کے تقریباً سب ہی بڑے حکمرانوں نے اپنے اپنے دور میں کوئی نہ کوئی انٹیلکچوئل زنانی رکھی۔ تاریخ کے صفحوں میں ڈھونڈنے سے جودھا بائی، ممتاز محل، زیب النساء، جنرل رانی، مسز سمپسن، ماتا ہری، ایوا براؤن یا مَنی مونیکا جیسی حسینائیں مل جائیں گی جو ہر کامیاب بیچارے کے پیچھے ہوتی ہیں تا کہ وہ اوپر نکل جائے تو اس کی جگہ لے سکیں۔ کچھ باتقدیر ہوتی ہیں کہ خوب بٹورتی ہیں جیسے کہ کورازون اکینو، سونیا سونیا، بندرا نائکہ اور خالدہ ضیا، جن کا نصیب میاں کے اوپر جاتے ہی کھلا۔ بے نظیر اس معاملے میں مختلف رہی کہ وہ کامیاب مرد کے پیچھے نہیں آگے تھی، جس نے ٹھوکا لگا کر اسے ٹہلا دیا۔

کچھ خواتین کو تو تقدیر نے سنگھاسن پر بیٹھنے کا موقع فراہم کر دیا اور کچھ اسی آس میں پورے سے بھی گئیں جیسے کہ ملکہ فرح دیبا یا مسز سمپسن جس کے چکر میں بادشاہ کا تاج بھی گیا اور تخت بھی۔

بیچارے بل کلنٹن سے رکھ رکھاؤ کے اس معاملے میں یوں چوک ہو گئی کہ اس نے گھر کی مرغی کے بجائے ایک نو خیز طالبہ کو دال سمجھتے ہوئے اپ گریڈ کرنے کی کوشش کی۔ بیچاری اپنی نا تجربہ کاری کی وجہ سے کلنٹن کی سگار نوشی کی قبیح عادت کا راز اپنے بچپنے کی وجہ سے چھپا نہ سکی اور موئے کو مواخذہ بھگتنا پڑا۔

تاریخی طور پر پریمی اور پریمیکا کے اس گٹھ جوڑ میں بیچارے عوام وہ دائمی مریض رہے جنہیں آج تک بدنصیبی کے ٹیکے لگ رہے ہیں۔

شفیق زادہ کراچی کے ایک علم دوست گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ طنز و مزاح و فلشنل تھرلر کے دشت کے سیاح ہیں۔ قلم کو آنکس کی طرح استعمال کر کے ہنسانے اور رلانے کا فن جانتے ہیں۔ ان کی پہلوٹھی کی کتاب ''ہم تماشا'' فکاہیہ ادب میں قابل قدر اضافہ ہے۔ ''پیارے میاں'' کے کردار کے خالق شفیق زادہ روٹی، روزگار اور روزی یعنی بھابھی کے لیے پردیس میں بسے ہوئے ہیں۔ یقیناً وہ ''ارمغان ابتسام'' کے لئے ایک شاندار اضافہ ہیں۔

بالآخر سڑک کا وہی مقام آ گیا۔ اُس نے ایک طویل سانس لی۔ اُس کی ماں نے اُسے کئی بار یہ جگہ دکھائی تھی جہاں اُس نے دن دیہاڑے اُسے جنم دیا تھا کیونکہ ڈاکٹروں نے ہسپتال میں جگہ نہ ہونے کے باعث اُسے داخل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

سڑک کے دونوں اطراف میں لوگ جمع تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں پارٹی پرچم اور اپنے محبوب قائد کی تصاویر تھیں جو بیرونِ ملک سے علاج کروا کر واپس آ رہا تھا۔ اُس کے آباء بھی اسی قائد خاندان کے معترف تھے۔ قائد کے نانا، اُس کی ماں اور اب نواسا، دوسری طرف اُس کا دادا، باپ اور اب وہ خود، ووٹ اور سپورٹ کا سلسلہ جاری تھا۔

یک بیک گاڑیوں کا ایک طویل قافلہ موڑ سے نمودار ہوا۔ نعروں میں زندگی دوڑ گئی۔ خود وہ بھی پُر جوش انداز سے نعرہ زن تھا۔

میاں تیرا ایک اِشارا
حاضر حاضر خون ہمارا

ڈاکٹر امواج الساحل

ہم نے مالٹا کھایا

جب ہم نے قطر کو شرف تشریف بخشا تو پٹرول دریافت ہوئے چند ہی سال گزرے تھے۔ حکومت نے ترقی کے دیگر منصوبوں پر عمل کرتے ہوئے تعلیم پر بھی توجہ دی۔ اسکول کھولنے کی پالیسی بنائی گئی، جس پر عمل پیرا ہونے میں ایک رکاوٹ یہ بھی آئی کہ والدین اپنے بچوں کو اسکول بھیجنا گوارا نہیں کرتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ اگر یہ سارا ٹائم اسکول میں کتابیں رٹیں گے تو غوطہ خوری اور دیگر پیشے کب سیکھیں گے، یہ تو مستقبل میں بھوکے مر جائیں گے۔ بچیوں کو تو گھر سے کہیں بھیجنا ویسے ہی طعنے والی بات تھی۔ گویا آج کل کوئی اپنی عورتوں سے پیشہ کروائے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ یہ لوگ تعلیم کی افادیت سے ناواقف ہیں، ویسے بھی جو فائدہ بارہ سال بعد حاصل ہو اس کا کیا فائدہ، تو کیوں نہ ان کو وہ فائدہ دکھایا جائے جو فوری ہو۔ 25 روپے پہلی کلاس کا وظیفہ مقرر ہوا، جو ہر سال دس روپے بڑھایا جاتا تھا۔ تب دیسی گھی 4 روپے کلو ہوتا تھا۔ یہاں انڈین روپے تھے، جو قیمت میں پاکستانی سے کم تھے۔ انڈین ۱۰۰ روپے کے ۹۵ پاکستانی ملتے تھے۔ اگر میری یادداشت صحیح ہے تو سونے کا تین سو روپے میں دس تولے کا کلکٹ آجاتا تھا۔ تعلیم، سٹیشنری وغیرہ تو پہلے ہی فری تھا، یونیفارم بھی سلوا کر دیا جاتا، جوتے بھی ناپ لے کر باہر کے ملک سے آرڈر پر بنوائے جاتے۔ یہاں تک کہ لڑکیوں کا خانہ داری کے پیریڈ میں پہننے والا یونیفارم بھی فری تھا، اگر کپڑا ان سلا تقسیم ہوتا تو ساتھ میں سلائی کے پیسے ہوتے۔ مزید مراعات یہ ملی کہ لنچ تقسیم ہوتا، ایک پلاسٹک کا لفافہ، جس میں ابلا ہوا انڈا، ایک بند، ایک تکون کی شکل کا "ز" اور ایک فروٹ، جو کبھی مالٹا کبھی سیب اور کبھی کیلا ہوتا۔ ساتھ میں دودھ کا لبنان سے درآمد کیا گیا ڈبہ بھی ملتا۔

باقی چیزوں کی روداد تو الگ الگ ہے، مالٹے کی سناتی ہوں، مالٹے یہاں بہت مہنگے تھے، ایک روپے کا ایک مالٹا تھا، جب کہ پاکستان میں پانچ روپے میں سو مالٹے کی بوری تھی۔ سیب اور کیلے سستے تھے، جو اکثر ابو لاتے، مالٹے کبھی کبھار لاتے اور کہتے کہ پاکستان جا کر جتنے مرضی کھا لینا۔ ہمیں حکم تھا کہ کھانا خراب نہیں کرنا، جو چیز نہیں کھانی ویسے ہی تازہ حالت میں کارٹون کے کور میں ڈال دیں، تاکہ کام کرنے والی غریبوں کے لئے لے جائے۔ سیب اور کیلا کھانا تو آسان تھا مگر مالٹے کو چھیلنا بہت مشکل تھا، لبنان سے ٹرکوں پر آنے والا فروٹ تازہ بھی نہیں رہتا تھا، اس لئے چھیلنا اور بھی مشکل کام تھا۔

پرنسپل کے پاس شکایت گئی کہ بچیاں مالٹا نہیں کھاتیں، اس کا حکم ہوا کہ وہ راؤنڈ لے گی اور جس بچی نے مالٹا نہیں کھایا ہوگا اسے سزا ملے گی۔ اس وقت سزا کا ایک ہی مطلب ہوتا تھا اور وہ تھا مار۔ جس دن مالٹے سرو ہوئے، سب کو مصیبت پڑ گئی کہ کارٹوں خالی ہونا چاہئے۔ مگر کھائیں کیسے؟ کئی لڑکیاں تو ناخنوں سے چھیلنے میں کامیاب ہو گئیں، باقی پریشان رہیں۔ کچھ لڑکیوں نے نظر بچا کر بستوں میں ڈال لئے تاکہ گھر لے جائیں، میں نے بھی یہی کیا۔ گھر میں تو ایک خوشی کا سماں تھا کہ مالٹا مفت میں ملا۔ امی نے اور دو چھوٹے بھائیوں نے کھایا، باقی میں نے کھالیا، کسی تبرک کی

طرح۔ امی کا کہنا تھا کہ ہر روز لے آیا کرو، جس دن نہ لاتی امی سمجھتی کہ میں وہاں پہ کھا گئی ہوں، بڑی مشکل سے سمجھایا کہ روز نہیں ملتا۔

خیر، ادھر پرنسپل کو رپورٹ ملی کہ اکثر لڑکیاں گھر کو لے جاتی ہیں، اس کا غضب پھر ساتویں آسمان پر پہنچ گیا، یہ کھانا لڑکیوں کے لئے آتا ہے، گھر والوں کا ہم نے ٹھیکہ لیا ہوا ہے کہ اُن کو کھلائیں؟ خبردار جو کوئی گھر لے کر گئی۔ اب میں اندازے سے سمجھ تو رہی تھی، مگر کہنا نہیں آتا تھا کہ چھری کے بغیر کیسے چھیلوں؟ اچھی بھلی مشکل میں پھنس گئی میں تو، صرف واحد ایک حل تھا کہ مالٹا چھیلوں، جو کہ میرے نازک ناخنوں سے ممکن نہ تھا۔ ناچار ابو سے پوچھا کہ چھری کو عربی میں کیا کہتے ہیں، توقع تو نہیں تھی مگر ابو نے بتا دیا کہ سکین کہتے ہیں۔ اب تو میرا خوب تماشہ لگا، میں نے گھر سے ڈائننگ سیٹ کی ایک چھری لے لی، جو لنچ کے وقفے سے پہلے کسی لڑکی نے دیکھ لی، اور ٹیچر کے پاس شکایت لگا دی کہ ہمیں اس سے خطرہ ہے اس کے پاس چھری ہے، ٹیچر نے آ کر اس پر قبضہ کر لیا، اور میں بتا بھی نہ سکی کہ اس کو لانے کا مقصد کیا ہے، اتنی عربی جو نہ آتی تھی۔ سو مجھے دہشت گرد قرار دے دیا گیا چھٹی کے وقت مجھے اس وارننگ کے ساتھ واپس دے دی گئی کہ خبردار جو آئندہ اسے تمہارے پاس دیکھا گیا تو۔ میں سوچتی رہ گئی کہ مالٹا کیسے کھایا جائے۔۔۔ جب دوبارہ مالٹے تقسیم ہوئے تو میرے پاس اسے کھانے کا کوئی طریقہ نہ تھا، میں نے اسے ڈیسک پر رکھ دیا۔۔۔ جب بھی ٹیچر آئے تو پوچھے کہ اسے کھاؤ تو میں ایک ہی لفظ بولوں کہ سکین، وہ پریشان کہ چھری کا مالٹا کھانے سے کیا تعلق، خوب سکین کہہ کہہ کر ان کو تنگ کیا، بڑی مشکل سے ان کی سمجھ میں آیا کہ چھری کے بغیر چھیلنا ناممکن ہے۔۔۔ پھر کسی اور کلاس میں ہماری ٹیچر نے دیکھا تو ٹیچر نیل کٹر کے ساتھ کی رنگ میں چھوٹی سی چھری سے مالٹے چھیل رہی تھی۔ اب انہیں میری مشکل کا اندازہ ہوا۔۔۔ میں تو اس کے بعد لمبی چھٹی پر پاکستان چلی گئی جب واپس آئی تو کیلے اور سیب مل رہے تھے، مالٹے بند تھے۔ اگلے سال لنچ سرو ہونا بند ہو گیا، بچے کافی تعداد میں اسکول میں آ چکے تھے۔

ڈاکٹر خورشید نسرین، ادبی دنیا میں امواج الساحل کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ قطر کے مختلف تعلیمی اداروں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتی رہی ہیں، عربی شاعری ان کا میدان سخن ہے، سب سے پہلے انکی رباعیاں قطر میں چھپیں، عرب شاعری کو ہائیکو سے روشناس کرایا، عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں افسانے ترجمہ کئے، اپنے بھی دونوں زبانوں میں لکھے، عربی شاعری کا اردو شاعری میں اور اردو شاعری کا عربی شاعری میں بھی ترجمہ کیا۔ "ارمغانِ ابتسام" میں مستقل لکھتی ہیں۔

مزاحیہ

گاندھی گارڈن ایک طنزیہ

محمد خلیل الرحمٰن

جارج اورول کی روح سے معذرت کے ساتھ

کلاچی کے ساحل پر لنگر انداز جہاز کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے یکبارگی وہ رکا، پلٹ کر مفتوح شہر کی جانب دیکھا اور پھر ایک بار بوجھل قدموں سے اوپر کی جانب چڑھنے لگا۔ عرشے پر پہنچ کر اس سے رہا نہ گیا اور وہ ایک بار پھر شہر کی طرف منہ کیے کھڑا ہو گیا۔ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی جانب اُٹھا دیئے اور چیخ کر بولا ''الوداع اے شہرِ بے مثال! کاش، اے کاش کہ میں تجھے تیری عظمت کے دِنوں میں دیکھ سکتا۔'' آج وہ اس شہرِ بے مثال سے رخصت ہو رہا تھا لیکن چشمِ تصور سے اس کی عظمت کے دِنوں کو دیکھ رہا تھا۔

۱۔ خواب

عروس البلاد کراچی کے عین قلب میں واقع چڑیا گھر جو کبھی گاندھی گارڈن کہلاتا تھا، آج بھی شہر کی سستی ترین اور خوبصورت ترین تفریح گاہ کے طور پر موجود ہے اور روزانہ لاکھوں بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کی تفریحِ طبع کا باعث بنتا ہے، شہر کے قدیم اور خوبصورت باغوں میں سے ایک ہے۔ یہ باغ کئی ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے جس میں دسیوں اقسام کے جانور، پرندے نیز درندے وغیرہ موجود ہیں۔ اس باغ کی داغ بیل اب سے کوئی ڈیڑھ دو سو برس قبل انگریزوں نے ڈالی جب وہ اِس شہرِ بے مثال کو خوبصورت عمارتوں، چمکتی ہوئی سڑکوں اور ہرے بھرے باغات سے سجانے لگے۔ ہندوستان بھر سے مسلمان اور ہندو رہنماؤں نے تحریکِ آزادی شروع کی اور آخرِ کار انگریزوں کو ملک چھوڑ کر جانے پر مجبور کردیا۔ انگریز سرکار نے ہندوستانیوں کے بے انتہاء دباؤ کے تحت بالآخر انہیں آزادی کی نوید سنادی اور خود بوریا بستر سمیٹ کر جہاں سارے ہندوستان کو خالی کر گئے، وہیں اِس شہرِ بے مثال سے بھی اپنے اَنمٹ نقوش چھوڑ کر چلتے بنے۔ گاندھی

گارڈن انہیں انمٹ نقوش میں سے ایک نقش ہے، جس کا نام بعد میں پاکستان سرکار نے بدل کر چڑیا گھر رکھ دیا۔ جانوروں کے لوہے کے بنے پنجروں کو از سرِ نو مضبوط تاروں اور لوہے کے جال کے ساتھ مضبوط تر کر دیا گیا۔ اِن کے لوہے کے دروازوں پر نئے اور نسبتاً بڑے تالے نصب کر دیئے گئے تاکہ چڑیا گھر میں محصور جانوروں اور پرندوں کو اِس نو دریافت شدہ قدر یعنی آزادی کی بھنک بھی نہ پڑنے پائے اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے پنجروں میں ہی قید رہ کر اپنی بقیہ زندگی بھی گزار دیں۔ یہی نہیں بلکہ اُن کی آنے والی نسلیں بھی اِس غلامی میں سسک سسک کر جینے پر مجبور ہوں۔

پھر یوں ہوا کہ ایک دِن شام کو جب سیر کے لیے آنے والے تمام افراد بشمول بچے بڑے اور بوڑھے اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئے تو چڑیا گھر کے رکھوالے مسٹر جونز نے چڑیا گھر کے بڑے گیٹ کو تو مقفل کر دیا، لیکن جانوروں کے پنجروں کے تالوں کا معائنہ کرنے سے قاصر رہے، اور لڑکھڑاتے ہوئے اپنے گھر کی جانب بڑھے، جو اِس چار دیواری کے اندر ہی واقع تھا۔ اِس غلطی کا باعث اِن کی بلا کی مے نوشی تھی۔ اُن کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لالٹین بری طرح ڈول رہی تھی۔ اور اُس کی مدھم روشنی چاروں جانب ماحول میں عجیب سحر انگیز سائے بکھیر رہی تھی۔ مسٹر جونز نے گھر میں گھس کر دونوں جوتے اُتار کر اِدھر اُدھر پھینکے، باورچی خانے سے متصل کال کوٹھری سے کچی شراب کی بوتل اُٹھائی باقی ماندہ شراب کو تلچھٹ تک چاٹ گئے۔ پھر اس بوتل کو یونہی فرش پر لڑھکاتے ہوئے دبے دبے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے کی جانب بڑھے، اور کواڑ کھول کر اندر اپنے بستر پر ڈھیر ہو گئے اور فوراً ہی خراٹے لینے لگے۔

کواڑ بند ہونے کے ساتھ ہی خراٹوں کی گونج فضاء میں بلند ہوئی تو چڑیا گھر میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلچل مچ گئی۔ اِس سے قبل دن میں ہر چہار جانب اِس بات کا خوب چرچا ہو چکا تھا کہ بوڑھے علامہ یعنی ببر شیر نے گزشتہ شب ایک خواب دیکھا ہے جسے وہ چڑیا گھر کے دیگر جانوروں کو سنانے کا خواہش مند ہے۔

کواڑ کھڑکنے کی آواز آئی تو تمام جانور فوراً اپنے اپنے پنجروں کی بیرونی سلاخوں کے قریب پہنچ گئے، تمام پرندے اپنے اپنے پنجروں کی چھت سے لٹک گئے یا ورفضاء میں موجود تمام چیل کوّے اور کبوتر وغیرہ موسیٰ کوّے کی سربراہی میں شیروں کے پنجرے کے قریب منڈلانے لگے۔ یہ سب کچھ تو ہوا لیکن کبھی چرند پرند درند کو اِس بات کا علم تھا کہ اِس بڈھے شیر کی دھاڑیں شیطان کو بھی پاتال کی تہہ سے نکال لائیں گی، لہٰذا انھیں یقین تھا کہ صبح سے پہلے پہلے یہ خواب اِس چڑیا گھر کے ہر جانور اور پرندے کی زبان پر ہوگا۔

شیروں کا پنجرہ دو حصوں پر مشتمل تھا ایک اندرونی کمرہ اور دوسرا حصہ بیرونی برآمدہ تھا جس میں اس وقت تمام شیر لیٹے ہوئے قیلولہ فرما رہے تھے۔ ببر شیر نے منہ پھیر کر اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھا جو اس کی بے چینی سے بے خبر سوئے پڑے تھے۔ ایک جانب جونا شیر جو آج کل گویا سارے زمانے سے خفا تھا، منہ موڑے لیٹا تھا، اس کے قریب ہی اس کی بہن بھاتاں شیرنی لیٹی تھی۔ ایک طرف کرنالی شیر خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ جونہی موسیٰ نے اپنی کرخت آواز میں چیخ کر علامہ کو بتایا کہ اس وقت میدان بالکل صاف ہے تو وہ ایک شاہانہ شان کے ساتھ اُٹھا، بوجھل قدموں کیساتھ چلتا ہوا صحن میں ایستادہ درخت کے تنے پر چڑھ گیا اور دھاڑا۔ "میرے عزیز ہم قفسو! کل رات میں نے ایک نہایت عجیب و غریب خواب دیکھا ہے جسے شریکِ محفل کرنا اور آپ جانوروں کے گوش گزار کرنا اپنے تئیں اپنا فرضِ منصبی جانتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو اپنا خواب سناؤں، آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ شاید اس کے بعد مجھے آپ سے اس طرح بات کرنے کا موقع پھر نہ ملے۔

میرے ہم قفسو! اس بات سے آپ سب بخوبی واقف ہیں کہ کس طرح اہلِ ہندوستان نے جدوجہد کر کے انگریز بہادر سے چھٹکارہ حاصل کیا ہے اور آزاد ہو چکے ہیں۔ دوستو! کتنے تعجب کی بات ہے کہ جو ہندوستانی کل ہماری طرح پنجروں میں قید تھے، آج آزاد ہو کر بھی ہمیں اسی طرح پنجروں میں قید رکھنے پر مصر ہیں جس

طرح کل ان کے انگریز آقا نے انھیں قید کیا ہوا تھا۔

اب میں تمھیں سناتا ہوں کہ رات میں نے خواب میں کیسی انہونی بات دیکھی۔ میں نے دیکھا کہ ہم سب جانور آزاد ہیں اور ایک خوبصورت جنگل میں آزادی کے ساتھ ادھر ادھر گھوم رہے ہیں۔ اس خواب کے ساتھ مجھے بچپن میں گایا ہوا ایک خوبصورت گیت بھی یاد آ گیا جو میں ابھی تک بھولا ہوا تھا۔ اس پیارے سے گیت کو میں بچپن میں ایک دل لبھانے والی دھن میں گایا کرتا تھا جو کچھ یوں تھی۔ اگرچہ آج میرا گلہ کچھ خراب ہے پھر بھی آج آپ کی خاطر میں کوشش کرتا ہوں۔''

ببر شیر نے اپنا گلہ صاف کیا تو سارا چڑیا گھر لرز اُٹھا۔ پھر اس نے اپنی پاٹ دار آواز میں گانا شروع کیا۔

سارے جہاں سے اچھا، جنگل نشاں ہمارا
ہم جانور ہیں اس کے، یہ گلستاں ہمارا
پنجرے میں ہیں اگر ہم، آزاد کل جو ہوں گے
سمجھو ہمیں وہیں پر، دل ہو جہاں ہمارا
دامن میں کھیلتے ہیں جس کے یہ سب درندے
گلشن یہی ہے گویا نام و نشاں ہمارا
جنگل کے سب ہیں باسی، آپس میں بیر کیسا
جب پیار سے رہیں گے، ہوگا مکاں ہمارا
چرتے ہیں ہم جہاں پر وہ ہے زمین اپنی
اُڑتے ہیں جس فضاء میں وہ آسماں ہمارا

جانوروں کو ببر شیر کا یہ گانا اس قدر بھایا کہ اُنہوں نے اس کی آواز میں آواز ملا کر خود بھی گانا شروع کر دیا اور کچھ ہی دیر میں چڑیا گھر کے تمام جانور بیک آواز گا رہے تھے۔ یہ گانا جو ایک غنائیہ تھا، بیک وقت خوش آواز، بارعب، وحشت ناک، گرج دار، چنگھاڑ سے بھر پور، سب کچھ تھا۔ تمام جانوروں کے مل کر گانے کی وجہ سے اس قدر شور برپا ہوا کہ کان پڑی آواز تک سنائی نہ دیتی تھی۔ اس غل غپاڑے نے مسٹر جونز کی نشے بھری نیند کو بھی بھگا دیا۔ وہ اٹھے، اپنی بھرمار بندوق نکالی اور اس میں بارود بھر کر ایک ہوائی فائر داغ دیا۔ فائر کی آواز سنتے ہی تمام جانور اپنے اپنے پنجروں میں دبک گئے اور یوں یہ ہنگامہ فرو ہوا۔

۲۔ آزادی

اِس واقعے کے کچھ ہی دن بعد ببر شیر مر گیا۔ اس طرح اس کی ایک پیشن گوئی پوری ہوئی تو جانوروں کو اس کے خواب پر یقینِ کامل ہو گیا۔ وہ اب دِن رات ببر شیر کا گایا ہوا گیت دہراتے رہتے۔ اسی طرز میں جس میں اس رات ببر شیر نے اُنہیں سنایا تھا۔ اس گیت کو گاتے ہوئے ان پر ایک کیف و سرور کا عالم طاری ہو جاتا۔ خاص طور پر جب وہ اس آخری شعر پر پہنچتے تو نہایت جوش و خروش کے عالم میں جھومنے لگتے ۔

چرتے ہیں ہم جہاں پر وہ ہے زمین اپنی
اُڑتے ہیں جس فضاء میں وہ آسماں ہمارا

جونا شیر جو سارے عالم سے خفا رہتا تھا، ببر شیر کی موت کے بعد اس کی خفگی گویا دور ہو گئی۔ اس گیت نے اسے بھی ایک نئی زندگی دے دی تھی۔ اب وہ نہایت جوش و خروش کے ساتھ اس گیت کو گایا کرتا اور سب جانور اس کی قیادت میں گیت کے بول دہراتے تو ایک سماں بندھ جاتا۔

کچھ ہی دنوں بعد جونا شیر کو کچھ کر گزرنے کا موقع مل گیا۔ ہوا یوں کہ اس دن صبح سویرے جب چڑیا گھر کے رکھوالے نے کھانا دینے کے لیے جونا شیر کے پنجرے کا قفل کھولا اور تازہ گوشت کا لوتھڑا اندر رکھا ہی چاہتا تھا کہ جونا شیر نے جو ایک جانب آنکھیں موندے لیٹا ہوا تھا، یکبارگی لپک کر مسٹر جونز کو ایک ہاتھ رسید کیا ہے تو وہ چاروں خانے چت، پنجرے سے دور سڑک پر جا گرے۔ وہ ابھی اس کاری ضرب اور دہشت کے زیر اثر بے ہوش ہوا ہی چاہتے تھے کہ اچانک اُنہیں حالات کی سنگنی کا احساس ہوا اور وہ اپنے بے ہوشی کے پروگرام کو مؤخر کرتے ہوئے زمین سے اٹھے اور بگٹٹ ایک جانب کو بھاگ لیے۔ جونا شیر کوئی عام جانور نہیں تھا کہ وہ مسٹر جونز کی طرف لپکتا، اس نے اطمینان کے ساتھ اپنے پنجرے سے نکل کر ادھر اُدھر دیکھا اور ایک دلخراش دھاڑ سے تمام جانوروں کو نیند سے اُٹھا دیا۔ سب سے پہلے اُس نے بندروں کے

دوست احباب ہمیں نئے نئے مشورے دینے لگے۔ کوئی کہتا کہ صبح دفتر جاتے وقت اخبار بیچتے جایا کرو۔ کوئی کہتا کہ اکیلے اخبار سے کیا بنے گا انڈے بھی ساتھ رکھ لیا کرو۔ ہم تو سوچا تھا کہ موٹر سائیکل کا عوام الناس پر رعب پڑے گا۔ بلاشبہ اس کی آواز اور دھوئیں کا تو لوگوں پر رعب پڑ چکا تھا مگر اس سے ہمارا اپنا رعب جاتا رہا تھا۔ اس کے ساز اور آواز سن کر ہم نے یہ اندازہ لگایا کہ اس سے دنیا ہی نہیں اپنی عاقبت بھی سنور سکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ رمضان المبارک کے دوران اسے گلی کوچوں، محلوں میں چلا چلا کر سحری کے وقت شہر کے سوتے با آسانی جگائے جا سکتے ہیں۔ شروع شروع میں ہماری موٹر سائیکل فرمانبرداری سے سٹارٹ ہوتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے انجن سے شرو حیا اڑتی گئی اور یہ عین مجمعے کے بیچ اڑیل ٹٹو کی طرح پیش رفت سے انکاری ہو جاتی۔ ہم اسے مستریوں اور کباڑیوں کی چیرہ دستیوں سے ڈراتے مگر اس کے گدھے کے کانوں جیسے ہینڈل پر جوں تک نہ رینگتی۔ اسی اثنا میں ہماری شادی خانہ آبادی ہو گئی مگر ہماری بیوی نے اسے ہمیشہ اپنی سوکن ہی سمجھا اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھی جب تک اسے مطلقہ نہ بنا دیا۔

مزاج بخیر از تنویر حسین

پنجرے کو کھولا تاکہ ان کا گروہ جلدی جلدی تمام جانوروں کے پنجروں کو کھول دے۔ ادھر جانور آزاد ہو رہے تھے، اُدھر مسٹر جونز نے چڑیا گھر سے باہر بھاگنے ہی میں عافیت سمجھی اور یوں چڑیا گھر کے تمام جانوروں نے آزاد ہو کر جونا شیر کی قیادت میں چڑیا گھر کی باگ ڈور سنبھالی۔ اب تک تو جونا شیر ایک قیدی تھا اور مجبوراً ایک چھوٹے سے پنجرے میں وقت گزارنے پر مجبور تھا، اب جو وہ آزاد ہوا ہے تو اس نے چڑیا گھر کے جانوروں کی حفاظت کی ذمہ داری سنبھال لی اور دن رات ایک کر دیئے۔ اب وہ دن رات چڑیا گھر کی بیرونی حدود کے چکر لگایا کرتا تاکہ کسی انسان کو چڑیا گھر کی طرف دوبارہ متوجہ ہونے کی ہمت نہ ہو اور جانور سکون کے ساتھ اس نئی حاصل کی ہوئی آزادی کے مزے لوٹ سکیں۔ اب چونکہ چڑیا گھر کے باہر سے گوشت کی فراہمی منقطع ہو چکی تھی اور جونا شیر اپنے ساتھی جانوروں کو مار کر کھانا اپنی شان کے خلاف جانتا تھا، لہٰذا گوشت نہ کھانے کی بنا پر وہ رفتہ رفتہ کمزور پڑتا گیا اور اسی حالت میں ایک دن تمام جانوروں کو داغِ مفارقت دے گیا۔

گاندھی گارڈن کے سارے جانور اُس کی موت پر خوب روئے۔ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ پھر انھوں نے اپنے ان دونوں چہیتے رہنماؤں یعنی ببر شیر اور جونا شیر کی یاد میں ایک ایک قدِ جانور پیتل کا مجسمہ بنوایا اور ان مجسموں کو چڑیا گھر کے بڑے گیٹ کے سامنے نصب کر دیا۔ اب جب بھی انھیں اپنے ان محبوب جانوروں کی یاد ستاتی، وہ گیٹ کے پاس پہنچ کر ان کے پیتل کے بنے ہوئے ان خوبصورت مجسموں کے گرد خاموش کھڑے ہو جاتے اور انھیں یاد کر کے ایک مرتبہ پھر روتے۔ دھاڑیں مار مار کر روتے۔

۳۔ قراردادِ مقاصد

جانوروں کی اس مصیبت میں جب اُن کے دو پیارے ان سے بچھڑ گئے تھے، کرنالی شیر نے ان کی ڈھارس بندھائی اور انھیں دلاسا دیا۔ وہ ان کا برے دنوں کا ساتھی تھا۔ اب انھوں نے اسے ہی سارے رہنمائی کے حقوق تفویض کر دیئے۔ اب وہ ان کا والی و وارث تھا۔ اُس کی پنجہ لہرانے کی عادت نہ صرف چڑیا گھر میں بلکہ اس باہر بھی مشہور ہو گئی۔ سارے جہاں میں اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ وہ بھی چڑیا گھر اور سارے جانوروں کی حفاظت کے لیے نت نئے منصوبے بنایا کرتا۔ ایک دن کرنالی شیر نے سب جانوروں کو ایک جگہ جمع کیا اور ان کے سامنے ایک تجویز رکھی۔

''آزاد جنگل کے آزاد جانورو! کیا آج وہ وقت نہیں آ گیا کہ ہم اپنے آپ کو کچھ قوانین کے تابع کر لیں؟ کیوں نہ ہم ایک

قرارداد کے ذریعے سے ان قوانین کا تعین کرلیں، کیونکہ یہ قانونِ فطرت ہے کہ آزادی بھی کچھ قوانین کے تحت ہی جچتی ہے؟''

دوسرے جانوروں کی تائید سے شہ پا کر اس نے کہنا شروع کیا ''ہر گاہ کہ چڑیا گھر کے تمام چھوٹے بڑے جانوروں اور پرندوں کا یہ اجتماع اس چڑیا گھر میں رہنے والے تمام جانداروں کے لیے ایک قانون بنانے کا عہد کرتا ہے۔''

''ہر گاہ کہ یہ قانون اس بات کی ضمانت دے گا کہ آئندہ اس چڑیا گھر میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کے اصولوں کی مکمل تعمیل ہوگی۔''

''جس میں قانون اور اخلاقِ عامہ کی حدود کے اندر بنیادی حقوق بشمول مساوی حیثیت و مساوی مواقع، قانون کی نظر میں مساوات اور سماجی اقتصادی اور سیاسی انصاف، آزادیٔ فکر و اظہار اور تنظیم سازی کی آزادی حاصل ہوگی۔''

''تاکہ اہلِ چڑیا گھر کو خوشحالی نصیب ہو اور وہ باہر کے تمام جنگلوں میں رہنے والے جانوروں میں اپنا جائز اور باوقار مقام حاصل کرسکیں۔ اور عالمی امن و ترقی اور تمام جانوروں کی خوشحالی کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کرسکیں۔''

جانوروں نے اتنی مشکل باتیں آج تک نہیں سنی تھیں لہٰذا وہ اپنی اپنی بولی بولنے لگے یہاں تک کہ کان پڑی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ کرنالی شیر نے یکبارگی دھاڑ کر سب کو خاموش کرایا اور پھر یوں گویا ہوا۔

''مجھے علم ہے کہ یہ باتیں آپ سب جانوروں کے لیے سمجھنا بہت مشکل ہیں لہٰذا میں نے آسان زبان میں جانوروں کے لیے سات سنہری اصول ترتیب دیئے ہیں جو کچھ اس طرح ہیں۔''

۱۔ جو کوئی دو ٹانگوں پر چلتا ہے وہ ہمارا دشمن ہے۔

۲۔ جو کوئی چار ٹانگوں پر چلتا ہے یا پروں والا ہے وہ ہمارا دوست ہے۔

۳۔ کوئی جانور کپڑے نہیں پہنے گا۔

۴۔ کوئی جانور بستر پر نہیں سوئے گا۔

۵۔ کوئی جانور شراب نہیں پیئے گا۔

۶۔ کوئی جانور کسی دوسرے جانور کو نہیں مارے گا۔

۷۔ تمام جانور آپس میں برابر ہیں۔

سب جانوروں نے ان سنہری اُصولوں کو غور سے سنا اور ان کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ بھیڑوں کی ننھی سی عقل میں صرف ایک بات ہی آئی اور فوراً زور زور سے ممیانے لگیں ۔

چار ٹانگیں اچھی تو دو ہیں خراب
چار ٹانگوں کا تو نہیں ہے جواب

اِسی اثناء میں ایرانی بلی نے پانی کی ٹنکی پر چڑھ کر یہ سب سنہری اصول ٹنکی کی چمکدار سطح پر لکھ دیئے جو اب دور سے بھی نظر آتے تھے۔ آتے جاتے جانوروں کی نظر ان سنہری اصولوں پر پڑتی تو وہ خوشی سے پھولے نہ سماتے اور زور زور سے دھاڑتے، ڈکراتے ممیاتے اور اپنی خوشی کا اظہار کرتے۔

۴۔ کرنالی شیر کا قتل

ایک دن ایک ایسا عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس نے تمام جانوروں کو دہشت زدہ کردیا۔ ہوا یوں کہ صبح سویرے کرنالی شیر کی دہاڑ سن کر سب جانور اُس کے گرد جمع ہوگئے۔ کرنالی شیر نے اپنا پنجہ اٹھایا اور اسے ہوا میں لہراتے ہوئے دھاڑا ''آزاد جنگل کے آزاد جانورو! یاد رکھو۔ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار سال کی زندگی سے بہتر ہے۔''

ابھی کرنالی شیر کی خوش الحانی کی گونج اردگرد کی عمارتوں سے ٹکرا کر لوٹی بھی نہ تھی کہ اچانک ایک جانب سے کچھ بھیڑیے نمودار ہوئے اور اس کی طرف لپکے۔ کرنالی شیر نے جان توڑ کر مقابلہ کیا لیکن بھیڑیوں نے چاروں طرف سے اس کو گھیر لیا اور نوچنے کھسوٹنے لگے۔ کرنالی شیر مرتے دم تک جی داری کے ساتھ مقابلہ کرتا رہا اور لڑتے لڑتے جان دے دی۔

تمام جانور اس واقعے سے اس قدر دہشت زدہ ہوئے کہ ان کے لیے اس وقت کچھ اور سوچنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اپنی اپنی جانوں کو بچانے کے لیے بھاگے اور اپنے اپنے پنجروں میں اپنے آپ کو چھپالیا۔ کچھ جانوروں کو یاد آیا کہ سنہری اصولوں میں سے

ایک اصول یہ بھی تھا کہ کوئی جانور کسی دوسرے جانور کو نہیں مارے گا۔ اگلی صبح جب دہشت کچھ کم ہوئی تو وہ ڈرتے ڈرتے اپنے پنجروں سے باہر نکلے۔ باکسر گھوڑا جس کی یادداشت دوسرے جانوروں کی بہ نسبت قدرے بہتر تھی اس نے پانی کی ٹنکی کی جانب نظر کی تو دیکھا کہ وہاں پر چھٹے سنہری اصول کی جگہ چونا پھرا ہوا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ چھٹا اصول یہ تھا کہ کوئی جانور دوسرے جانور کو نہیں مارے گا۔ اس نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا۔ کوئی بھی جانور اس کی بات پر کان دھرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ سب اپنی حفاظت کے لیے ادھر ادھر دبکے دبکے پھر رہے تھے۔

۵۔ جوتیوں میں دال بٹتی ہے

اُس رات بھیڑیوں کے جتھے کا اجلاس ہوا۔ بھیڑیوں کا سربراہ اکیلا نامی ایک خونخوار بھیڑیا تھا۔ اس نے صلاح دی کہ فی الحال بھیڑیوں کو چاہیے کہ وہ منظر عام پر نہ آئیں اور اس نے تمام بھیڑیوں کی مشاورت سے بینجمن نامی ایک انتہائی گدھا قسم کے گدھے کو چڑیا گھر کا سربراہ چن لیا۔ دن گزرتے رہے اور گدھے صاحب اپنی گدھا پن کی حرکتوں سے سے جانوروں کو پریشان کرتے رہے۔ سب جانور اس گدھے سے نالاں تھے لیکن انھیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ اصل بادشاہت بھیڑیوں ہی کی ہے۔

اِسی دوران کچھ عجیب وغریب واقعات رونما ہونے لگے۔ ہر کچھ دن بعد ایک آدھ جانور غائب ہونے لگا۔ رات کو کسی جانور کی کربناک چیخیں سنائی دیتیں اور اگلی صبح ایک جانور اپنے پنجرے سے غائب ہوتا۔ البتہ چڑیا گھر میں ایک جانب ہڈیوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر نمودار ہوا جو وقت کے ساتھ ساتھ اونچا ہوتا جا رہا تھا۔

۶۔ رکھوالے بادشاہ بنتے ہیں

سب کچھ ہوا لیکن گدھے نے اپنی گدھے پن کی حرکتیں نہ چھوڑیں، یہاں تک کہ اس سے سبھی تنگ آ گئے۔ ان سبھی میں اتفاق سے بھیڑیے بھی شامل تھے۔ گدھے کو اور کچھ نہ سوجھتا تو وہ اپنی بھونڈی آواز میں ڈھینچوں ڈھینچوں کرنا شروع کر دیتا۔ یہ صورتحال تمام جانوروں کے اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتی اور وہ سب مل کر گدھے پر پل پڑتے اور مارتے مارتے اُس کا بھرکس نکال دیتے۔ بیچارہ گدھا اپنی مسکین سے صورت لے کر رہ جاتا۔ اب کیا اسے اتنی بھی آزادی حاصل نہیں تھی کہ وہ ڈھینچوں ڈھینچوں ہی کر سکے۔ کمال ہے۔ ایک دن بھیڑیوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور انھوں نے دن دیہاڑے ہی اس بیوقوف گدھے کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا اور اس دن کے بعد سے جانورستان پر ان کا راج قائم ہو گیا۔ اب وہ کھلم کھلا اپنے حرکتیں کرنے کے لیے آزاد تھے۔ اب انھیں کوئی بھی ٹوک نہیں سکتا تھا۔ اب تمام جانور ان کے تابعِ فرمان تھے۔ انھیں یہ چڑیا گھر پچھلے چڑیا گھر کی بہ نسبت بہت اچھا لگا۔ اب وہ بلا شرکتِ غیرے چڑیا گھر کی ہر چیز کے مالک تھے۔ اب وہ چڑیا گھر کے بادشاہ تھے۔

۷۔ جنگِ جون، جنگِ جنون

جون کے مہینے میں ایک دن ابھی رات کے مختصر لمحات ختم بھی نہیں ہوئے تھے اور سپیدۂ سحری نمودار ہوا ہی چاہتا تھا اور چڑیا گھر کے جانور صبح کی نشہ آور نیند کے مزے لوٹ رہے تھے کہ اچانک چڑیا گھر کے باہر کی جانب سے بھرمار بندوقوں کے چلنے کی آواز آئی اور چڑیا گھر کا پرانا رکھوالا مسٹر جونز اپنے چند آوارہ گرد دوستوں کے ساتھ فاتحانہ انداز میں چڑیا گھر کی مشرقی دیوار میں ایک بڑا سا سوراخ بنا کر داخل ہوا۔ سب لوگوں کے ہاتھوں میں بھرمار بندوقیں تھیں جنہیں انہوں نے اپنے سامنے تان رکھا تھا اور ان کے خطرناک تیور بتا رہے تھے کہ وہ سامنے آنے والے ہر جانور کو بھون ڈالیں گے۔

وہ صبح بھی بڑی عجیب صبح تھی۔ تمام جانور ہڑبڑا کر اُٹھے اور اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ اِس افراتفری کے عالم میں انہیں اپنا کچھ ہوش ہی نہ رہا البتہ کچھ جانوروں نے اس صورتحال کا فوراً ادراک کر لیا اور بھاگتے ہوئے جانوروں کو جمع کر کے ایک لائحہ عمل ترتیب دینے میں مصروف ہو گئے۔ چند لمحوں کی اس ملاقات کے بعد تمام جانوروں نے ایک مرتبہ جم کر حملہ آوروں کو گھیر لیا اور چاروں طرف

سے ان پر پل پڑے۔ حملہ آوروں نے کب اس طرح کی صورتحال کا مقابلہ کیا تھا۔ وہ تو جانوروں کو ایک ہی ہلے میں زیر کردینے کے ارادے سے آئے تھے۔ جواباً جانوروں کے خوں خوار دانتوں اور زہریلے پنجوں کا سامنا کرنا پڑا تو وہ بدحواس ہوکر بھاگے اور بھاگتے وقت اپنی بھرمار بندوقیں وہیں چھوڑ گئے۔ جس جنونی انداز میں جانوروں نے اپنے اس چڑیا گھر کا بچاؤ کیا وہ دیدنی تھا۔ اس دن کے بعد اس جنگ کو جنگِ جون، جنگِ جنون کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ یہ وہ دن تھا جب سب جانوروں نے مل کر اپنے اس خوبصورت باغ کی حفاظت میں اپنی جانوں کی بھی پروانہ کی تھی۔ انھیں اپنے اس باغ پر فخر تھا۔ کیوں نہ ہوتا، یہ ان کا اپنا جنگل تھا جہاں پر سب جانور آزاد تھے۔ انھوں نے بھگوڑے مسٹر جونز اور ان کے ساتھیوں کے قبضے سے حاصل کی ہوئی بھرمار بندوقوں کو ایک پنجرے میں جمع کردیا اور اسے قومی عجائب گھر قرار دے دیا۔

۸۔ سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ

جنگِ جون، جنگِ جنون کے نتیجے میں جہاں پڑوسیوں پر جانوروں کی دھاک بیٹھ گئی وہیں اس جنگ کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ سب جانوروں میں جذبۂ حب الوطنی ایک مرتبہ پھر جاگ اٹھا اور بھیڑیئے جو ابھی تک اس چڑیا گھر کی تقدیر کے مالک بنے بیٹھے تھے، دُبک کر ایک طرف کو بیٹھ رہے اور تمام جانوروں نے ایک مرتبہ پھر اتفاقِ رائے سے چند جانوروں کو چُن لیا جو ان کے اس باغ کی رکھوالی اور اس پر راج کا حق رکھتے تھے۔ جانوروں کی ایک مشترکہ کونسل ترتیب دی گئی اور ہر فیصلہ اتفاقِ رائے سے کیا جانے لگا۔ یوں ایک مرتبہ پھر اس آزاد جنگل میں جمہوریت نے ایک نیا جنم لیا۔

۹۔ پون چکی بنتی ہے

کہتے ہیں کہ ایک ولندیزی کے گھر ایک پالتو بلی رہا کرتی تھی۔ یہ بلی دراصل چڑیا گھر سے ہی لائی گئی تھی۔ ایک مرتبہ وہاں کی خوبصورت ایرانی بلی نے کچھ بچے دیئے تو مسٹر جونز نے ان بچوں کو نہایت صفائی کے ساتھ بلی کے پنجرے سے اڑایا اور بیچ ڈالا تھا۔ اس ولندیزی نے جو گارڈن روڈ ہی پر بندر روڈ کے قریب رہتا تھا، مسٹر جونز سے بلی کا ایک بچہ خریدا اور اسے پال لیا۔ ولندیزی کو پون چکی کا ڈیزائین بنانے کا بہت شوق تھا اور وہ دن رات اپنے ڈرائینگ روم میں اپنی میز پر بیٹھا پون چکی کی تصویریں بنایا کرتا۔ ایک دن موقع پاکر بلی نے ان تصویروں میں سے کچھ بنڈل اپنے منہ میں پکڑے اور فوراً ہی وہاں سے رفو چکر ہوگئی اور دوڑتی دوڑتی گاندھی گارڈن پہنچ گئی۔

اب سنیئے کہ بلی کی یہ ناز یبا حرکت کالے تیندوے کے پلان کے عین مطابق تھی۔ اب جبکہ پون چکی کے ڈیزائن کی ساری ترتیب و تفصیل اس کے ہاتھ میں آگئی تھی، اس نے پہلے تو بلی کی پیٹھ تھپکنی چاہی لیکن شیر کی خالہ بہت چالاک نکلی اور فوراً لپک کر درخت پر چڑھ گئی۔ کالا تیندوا ہنسا اور بولا ''بی مانو! میں تو صرف تمھاری پیٹھ تھپکنا چاہ رہا تھا۔ خیر''

اب اس نے تمام جانوروں کو اکٹھا کیا اور ان کے سامنے پون چکی بنانے کی تجویز رکھی۔ سب جانور یہ عجیب وغریب منصوبے کی تفصیل سن کر حیران رہ گئے۔ اب کالے تیندوے نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں کو آواز دی اور نہایت جذباتی انداز میں سب جانوروں سے خطاب کیا۔

''پون چکی بناؤ گے؟''

''بنائیں گے۔''

''لڑو گے؟''

''لڑیں گے''

''مرو گے؟''

''مریں گے''

''گھاس کھاؤ گے''

''کھائیں گے''

پھر یوں ہوا کہ جانوروں نے بھوکے رہ کر، گھاس کھا کر، لڑمر کر پون چکی کا کام شروع کیا اور اسی اسپرٹ میں دن رات کام کرتے ہوئے دو تین مہینوں کے اندر ہی پون چکی کو مکمل کرلیا۔ پون چکی ان کے ہمت و حوصلے کی داستان تھی جو انھوں نے اپنی

انتھک محنت سے رقم کی تھی۔ باہر والوں نے سنا تو دنگ رہ گئے۔ اب چڑیا گھر اپنے لیے خود بجلی پیدا کرتا تھا جو ایک بےمثال کارنامہ تھا۔

۱۰۔میوزیکل چیئر کا کھیل

کہتے ہیں جمہوریت ایک دم نہیں آجاتی بلکہ رفتہ رفتہ آتی ہے۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جمہوریت ایک ایسا نظام ہے جو اپنا قالب نکالتا ہے اور یہی ہوا۔ چڑیا گھر کے جانور جمہوریت کے اس قدر عادی ہو گئے کہ اب یہ انھیں اپنی روح میں سمویا ہوا ایک خوبصورت خیال محسوس ہوتی۔ رفتہ رفتہ دیگر دوسرے جانور اس کھیل سے اکتا گئے اور اس پُر خطر میدان میں صرف سُور رہ گئے۔ اب یوں ہوتا کہ سور ہی آپس میں انتخاب لڑتے۔ کبھی ایک سُور جیت جاتا کبھی دوسرا سُور جیت جاتا۔ جہاں دوسرے جانور اس نظام سے لاتعلق ہوئے وہیں سُوروں کو میوزیکل چیئر کا یہ کھیل اس قدر بھایا کہ انھوں نے اس کھیل کو مستقل کھیلنے کا فیصلہ کرلیا۔ اب وہ ہر دوسرے تیسرے ماہ انتخاب انتخاب کھیلا کرتے۔ بھیڑیوں کا جتھا اس کھیل سے بہت محظوظ ہوتا۔ انھیں علم تھا کہ کوئی بھی سور جیتے، جیت اصل میں انھیں کی ہوتی تھی۔

۱۱۔ایک غم ناک کہانی کا المناک انجام

بھیڑیوں اور سُوروں کے اِس گٹھ جوڑ نے نت نئے گل کھلانے شروع کر دیئے۔ اب رفتہ رفتہ جانوروں کو پھر سے پنجروں میں بند کرنا شروع کر دیا گیا۔ یہ سلسلہ شروع تو شر پسند بندروں سے ہوا لیکن بہت آہستہ آہستہ جانوروں کو پنجروں میں منتقل کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، پھر ان کے پنجروں پر قفل لگائے گئے۔ یہاں تک کہ ایک دن ایسا آیا کہ سُوروں اور بھیڑیوں کے علاوہ چڑیا گھر کا ہر جانور دوبارہ پنجرے میں بند ہو چکا تھا۔ جانور حیران پریشان ان سب حرکتوں کو دیکھا کیے۔ انھیں ببر شیر، جونا شیر اور کرنالی شیر کی یاد آتی لیکن وہ اسے ایک بھولا بسرا خواب سمجھ کر نظر انداز کر دیتے۔ کبھی کبھی کوئی جانور نیند میں بڑبڑانے لگتا۔

سارے جہاں سے اچھا، جنگل نشاں ہمارا
ہم جانور ہیں اس کے، یہ گلستاں ہمارا
پنجرے میں ہیں اگر ہم، آزاد کل جو ہوں گے
سمجھو ہمیں وہیں پر، دل ہو جہاں ہمارا

دوسرے جانور اسے سن کر حیران رہ جاتے۔ شاید یہ بے معنی قسم کے الفاظ انھوں نے پہلے بھی سنے تھے، یا شاید انھوں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ کچھ الفاظ تو اِس قدر عجیب تھے کہ جن کو سن کر اِن کی چیخیں نکل جایا کرتیں مثلاً ؎

چرتے ہیں ہم جہاں پر وہ ہے زمین اپنی
اُڑتے ہیں جس فضاء میں وہ آسماں ہمارا

جن جانوروں کے پنجرے پانی کی ٹنکی کے سامنے تھے، وہ دیکھتے تھے کہ اِس ٹنکی پر جانورستان کا انوکھا نعرہ درج تھا۔

’’ تمام جانور آپس میں برابر ہیں مگر کچھ جانور زیادہ برابر ہیں‘‘۔

بندروں کو یقین تھا کہ کسی زمانے میں اس ٹنکی پر اور کچھ بھی لکھا ہوا ہوتا تھا لیکن اُن کے معصوم ذہن اس سے آگے سوچنے سے معذور تھے۔ اب تو یہی ان کا حال تھا اور یہی ان کا مستقبل۔

محمد خلیل الرحمٰن مشہور اُردو ویب سائیٹ اردو محفل (اردو ویب ڈاٹ او آج جی سلیش محفل) کے اردو ادب کے شعبے کے مدیر ہیں۔ طنزیہ و مزاحیہ شعر کہتے اور نثر لکھتے ہیں۔ دلچسپ انداز میں اپنے والد کی سوانح لکھی جسے ماہنامہ تعمیرِ افکار نے ’’مولانا آزاد نمبر‘‘ کی شکل دے ڈالی۔ یہی سوانح اُردو محفل پر بھی ’’ فسانۂ آزاد ‘‘ کے نام سے موجود ہے۔ اسکول کے زمانے میں چھوٹے بھائی نے اُن کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا:-

شاعرِ اسکول ہیں یہ، نام اِن کا ہے خلیلؔ
سوتے سوتے میں بھی اکثر شعر فرماتے ہیں یہ
شاعری کا بھوت اِن پر جب بھی ہو جائے سوار
اونچے اونچے شاعروں کو مات کر جاتے ہیں یہ

سلامی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

سنائی دیتی ہے ہر سو خوشی کی اب گھنٹی
مبارک آپ کو شادی و سی ڈی سیونٹی

یہ زندگی کا سفر یوں ہو باعثِ توقیر
کہ ساتھ ساتھ رہیں آپ کے سدا تطہیر

سنا ہے ہم نے کہ حرکت میں خوب برکت ہے
یہ بائیک اس لئے دولہا کے پیش خدمت ہے

نئے اشارے ہیں چالو بریک اس کے ہیں
بہ ظاہر آج ارادے تو نیک اس کے ہیں

لگا ہے اس میں جو چھوٹا سا ایک سائلینسر
پیام اس کا ہے غصہ نہ کیجئے یکسر

خوش رہ کے جو گزرے سفر وہ اچھا ہے
جو شر سے بچ کے رہے ہے بشر وہ اچھا ہے

بتا رہا ہے جو اس میں ہے نصب آئینہ
سفر تمام ذرا دیکھ بھال کر کرنا

ہو کنٹرول میں اسپیڈ ایکسیڈینٹ نہ ہو
کچھ اس طرح سے سفر آج اختیار کرو

سفر سڑک پہ ہو یا ہو یہ زندگی کا سفر
سکوں سے طے کریں اس کو تو سب سے ہے بہتر

ہو خوش گوار فضا دل بھی خوش اثر ہو جائے
بھرے بغیر جو چالان طے سفر ہو جائے

سفر کبھی بھی کوئی پُر خطر نہ آپ کریں
خدا کرے کہ سفر میں suffer نہ آپ کریں

سفر کے واسطے تحفہ عوامی حاضر ہے
قبول کیجئے بھائی سلامی حاضر ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

یہ کوئی بچہ ہے یا ۔ ۔ ۔

برق سی بھر دی خدا نے گویا جان و تن میں ہے
بے سکوں سے اس کو چڑ ہر لحظہ یہ ایکشن میں ہے
یوں رواں ہے جیسے طوفانی گھٹا ساون میں ہے
ماہرِ کرتب ہے ایسا طاق اپنے فن میں ہے
پاؤں برتن میں ہیں الجھے ، ہاتھ بھی سالن میں ہے
یہ کوئی بچّہ ہے یا پسٹن کسی انجن میں ہے

گویا سرکس سے ہو آیا ، ایسے ہیں بچّے کے ڈھنگ
گھر کے سارے بوڑھے بچّے عورتیں ہیں اس سے تنگ
حشر کی ہیں ساعتیں ، گھر بن گیا میدانِ جنگ
کرسیاں اُلٹی پڑی ہیں ، سجدہ کرتے ہیں پلنگ
ایسی پھرتی کب بھلا دیکھی کسی ناگن میں ہے
یہ کوئی بچّہ ہے یا پسٹن کسی انجن میں ہے

روح رہتی ہے بدن میں اس کے ہر دم بے قرار
صبر سے ہے بیٹھنا مشکل ، کھڑا ہو بار بار
اپنی باری کا نہیں کرتا ہے ہرگز انتظار
بات پوری سُن نہیں سکتا کبھی یہ " ہونہار "
پوچھنے سے پہلے ہی کہہ دیتا ہے جو من میں ہے
یہ کوئی بچّہ ہے یا پسٹن کسی انجن میں ہے

پاؤں میں چکر ہے اس کے ، اس قدر ہیں تیزیاں
ہیں ہلاکت خیز اس کی چار سو چنگیزیاں
مانگے شیطاں بھی اماں وہ ہیں شرارت خیزیاں
باتیں سچّی ہیں نہیں ہیں یہ سخن آمیزیاں
قلب کو اس کے سکوں تو " تک دھنا دھن دھن " میں ہے
یہ کوئی بچّہ ہے یا پسٹن کسی انجن میں ہے

کب یہ دیتا ہے توجہ سنتا ہے کب پوری بات
ایک ہلچل سی مچی ہے مضطرب ہے اس کی ذات
تیز اتنا ہے کہ دے رفتار میں راکٹ کو مات
زندگی کی اس کا " موٹو " گھونسا ، مُکا اور لات
راز جس کا آشکارا ہاتھ کی سوجن میں ہے
یہ کوئی بچّہ ہے یا پسٹن کسی انجن میں ہے

مرتکز رہتی نہیں اس کی توجہ ایک پل
یہ چلاتا ہے سخن کے کھیت میں باتوں کا ہل
ہے زباں قینچی ، ذہن راکٹ ، مشینی ہر عمل
بات اس کی ہوتی ہے اکثر ہی بے موقع محل
جسم ہے گر شہر میں تو ذہن اس کا بن میں ہے
یہ کوئی بچّہ ہے یا پسٹن کسی انجن میں ہے

زندگی طوفان ہے ہر سمت ہے اک کھڑبڑی
چین کی لگتا ہے مشکل سے ہی اب آئے گھڑی
زیرِ لب کرتے ہیں اکثر لوگ یہ ہی بڑبڑی
کچھ تو ہے ماحول میں اور کچھ ہے اندر گڑبڑی
چاک کیسا زندگی یہ تیرے پیراہن میں ہے
یہ کوئی بچّہ ہے یا پسٹن کسی انجن میں ہے

وقت وقت کی بات

میں اُن زلفوں سی راتوں میں
جب جگنو کے پیچھے بھاگا
رستے کا ہر پتھر گھاس کے دریا سا تھا
ہر ٹھوکر اک تحفے سی تھی
ایک جنوں کی مستی تھی جو مجھ کو اُڑا کر لے جاتی تھی
کسی کا بھاشن کب سنتا تھا
ماں کی ارے رے
بابا جی کا اوئے اوئے
یوں مت بھاگو
گر جاؤ گے
چوٹ لگے گی
لیکن میں تھا، چوکڑیاں تھیں
وہ میرے بچپن کے دن تھے
لیکن اب کے
جب جمیرے اپنے بچے
جگنوؤں کے پیچھے بھاگیں
تو بڑھ بڑھ کے
روکتا ہوں، میں
ٹوکتا ہوں میں
یہ کیا لایعنی کاموں میں الجھے ہو تم
عقل کرو تم!
وقت کی بربادی سے حاصل؟
پڑھو لکھو تم!!

نوید ظفر کیانی

ڈاک۔ٹر

ذیشان فیصل شان

ہلکا سا ہے بخار چلیں ڈاکٹر کے پاس
کیجے نہ انتظار چلیں ڈاکٹر کے پاس

خرچہ ہے کچھ دواؤں کا باقی ہے فیس کا
بس ایک دو ہزار چلیں ڈاکٹر کے پاس

کرنا پڑے جو ٹیسٹ کوئی ناشتے سے قبل
جلدی سے منہ نہار چلیں ڈاکٹر کے پاس

پیلے ہیں کیپسول دو، اورنج ٹیبلٹ
سیرپ ہیں تین چار چلیں ڈاکٹر کے پاس

بے چینی اضطراب کا انجیکشن بھی ہے
آجائے گا قرار چلیں ڈاکٹر کے پاس

چھوڑیں حکیم چھوڑیے سرکاری ہسپتال
چھوڑیں بھی یہ مزار چلیں ڈاکٹر کے پاس

روکیں اگر علاج کو مالی رکاوٹیں
لے لیجیے ادھار چلیں ڈاکٹر کے پاس

رولا نہیں ہے شان فقط ایک بار کا
جانا ہے بار بار چلیں ڈاکٹر کے پاس

آپس کی بات

میرون، سرخ، سبز، سبھی ساڑیوں پہ طنز
کنگن پہ، نتھ پہ، ہار پہ اور بالیوں پہ طنز

اسٹیج کے قریب ہی کرتے ہیں رشتہ دار
دولہے پہ اعتراض یا باراتیوں پہ طنز

کرتی ہیں جان بوجھ کے پھپھو بھی زور سے
اپنے سوا جہان کی کل شادیوں پہ طنز

اپنے لئے بلائیے پنڈت یا پادری
کرتے رہے ہیں آپ سبھی قاضیوں پہ طنز

کھاتے ہیں سب پلیٹ میں بھر بھر کے بوٹیاں
ہوتا مگر ضرور ہے بریانیوں پہ طنز

کم ہو تو پھر جہیز کی تنگی پہ اعتراض
بھرپور مل گیا تو فراوانیوں پہ طنز

ماموں بھی خاندان سے ناراض ہو گئے
خالہ جو بار بار کریں مامیوں پہ طنز

آپس کی یہ لڑائی تھی بڑھتی چلی گئی
ہونے لگا ہے خیر سے پڑنانیوں پہ طنز

ہوتا ہے ابتدائیہ جنگِ عظیم کا
بھائی کے سامنے نہ کریں بھابیوں پہ طنز

کرنا پڑے گا آج سے تہذیب کا علاج
ورنہ کرے گا شان بھی بیماریوں پہ طنز

ذیشان فیصل شان

پکوڑے بیچو

احمد علوی

یہ حکومت کا ہے فرمان پکوڑے بیچو
کہتے ہیں ملک کے سلطان پکوڑے بیچو

کام دراصل ہے یہ ظل الٰہی کی پسند
فائدہ ہو یا ہو نقصان پکوڑے بیچو

ڈگریاں سر پہ لئے بوجھ بنے ہو سب پر
کھولو فٹ پاتھ پہ دوکان پکوڑے بیچو

ایکٹنگ تم کو کہاں آتی ہے ہم سے بہتر
شاہ رخ خان اور سلمان پکوڑے بیچو

پانچ کے پانچ سو جے شاہ نے کئے ہیں جیسے
مجھ سے کہتی ہے میری جان پکوڑے بیچو

نوکری کے لئے دفتر کے نہ چکر کاٹو
ایم اے بی اے کی یہی شان پکوڑے بیچو

ملک کے واسطے تم لاؤ ودیشی مدرا
جا کے اب چین اور جاپان پکوڑے بیچو

ملک میں اک یہی جی ایس ٹی فری ہے بزنس
اب نہ لیڈر بنو نہ ڈان پکوڑے بیچو

تم نہ مندر پہ لڑو اور نہ مسجد پہ لڑو
ملک کے ہندو مسلمان پکوڑے بیچو

میری صورت اگر کرنی ہے ترقی تم کو
چائے بیچو یا شریمان پکوڑے بیچو

پوچھتا کوئی نہیں تم کو ادب میں علوی
کس لئے چھاپا ہے دیوان پکوڑے بیچو

میرا فوٹو

نوید صدیقی

میرا فوٹو
جو اس کے بستر کی
ایک جانب
تپائی پر تھا دھرا
آج دیوار پر نظر آیا
سوچتا ہوں کہ مصلحت کیا ہے؟
دیکھنا چاہتا ہے یا مجھ کو
اس نے دیوار سے لگایا ہے

تنویر طاہر کیانی

دِکھتا سنتا کم ہے لیکن صورت تو متوالی ہے
کانپتی ٹانگوں کو تم چھوڑو، گالوں پر تو لالی ہے

ساٹھ برس کی دلہن بولی اسی برس کے دولہا سے
دال میں کچھ کچھ کالا کیسا ساری دال ہی کالی ہے

سر پر کالک ملنا بہتر منہ پر کالک ملنے سے
دلہن بوڑھی، دولہا بوڑھا، رشتہ خاص حلالی ہے

پہلی سیر کو نکلے ہی تھے رُک کے دولہا یوں بولا
ہم تم ڈوب کے مر نہ جائیں آگے دیکھو نالی ہے

کاغذ چُن کے شام ڈھلے جب تازہ گجرے لاؤں تو
مجھ کو بوڑھا مت تو کہنا میرے لئے یہ گالی ہے

دلہن بولی ساٹھ برس کا جوبن تیرے نام کیا
دولہا بولا ہم نے چاہت اسی برس ہی پالی ہے

شہناز شازی

یہ بجا کہ گفتگو کے ہیں ہزارہا وسائل
مگر ان کے ظلم سے ہم ہیں بہت شدید گھائل

مری جان چاہ کر بھی تجھے کر نہ پائے مائل
کبھی منقطع ہے بجلی کبھی نیٹ کے ہیں مسائل

ترے واسطے خریدا نیا فون مہنگا پیکیج
میں تجھی کو چاہتا ہوں کروں کس طرح میں قائل

کوئی اہم کام ہو تو اسے ہینگ ہونا لازم
مجھے بے طرح ستائے میرا نیٹ ہے بدخصائل

کروں چیٹ تجھ سے کیسے تو ہی راستہ بتادے
ملا ویسٹ تیرا نمبر کیا جب بھی اس کو ڈائل

کرو بند وائے فائے نہ کرو انرجی زائل
کبھی گیت گنگناؤ کبھی پڑھ لو کچھ رسائل

ترے پاس سیو ہوگی مجھے سینڈ کر دوبارہ
ری کرپٹ ہو چکی ہے تری سلفیوں کی فائل

احمد علوی

اولا اوبر میں انہیں دن بھر گھمانا عشق ہے
اور کرایہ جیب سے اپنی چکانا عشق ہے
رات بھر تھانے کے اندر مار کھانا عشق ہے
مار کھا کر بھی ہمیشہ مسکرانا عشق ہے
ایڈیٹ بن کر دکھانا ان کو تینوں اپڈیٹ
میکڈی میں پزہ اور برگر کھلانا عشق ہے
چائے پینے کے بھی اپنی جیب میں پیسے نہیں
آسماں سے چاند لیکن توڑ لانا عشق ہے
سر کو بیوی کے دبانا یہ ہے فرض شوہری
پاؤں محبوبہ کے خوابوں میں دبانا عشق ہے
بس میں ڈی ٹی سی کی چلنا اک طرح کا ہے جہاد
میٹرو کی سیڑھیوں پر بیٹھ جانا عشق ہے
دیکھ کر خونخوار کتے گیٹ پر محبوب کے
اپنی عزت کو بچا کر بھاگ جانا عشق ہے
عاشقوں کی یہ بھی لکھا ہوتا ہے تقدیر میں
بن کے ماموں ان کے بچوں کو کھلانا عشق ہے
درجنوں باٹا کی تجھ پہ جوتیاں ہوتے ہوئے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا عشق ہے

خواب

میں سویا جو اِک شب تو دیکھا یہ خواب
بڑھا اور جس سے مِرا اضطراب
یہ دیکھا کہ کچھ جانور ہیں کہیں
چلے جارہے ہیں دمِ واپسیں
جو کچھ حوصلہ پاکے آگے بڑھا
تو دیکھا کہ ریوڑ وہ بکروں کا تھا
وہ ابرق سی پوشاک پہنے ہوئے
کڑے اُن کے پیروں میں بجتے ہوئے
اسی سوچ میں تھا کہ بکرا مِرا
مجھے اِک کنارے دکھائی دیا
وہ لنگڑا تھا اور تیز چلتا نہ تھا
کڑا اس کے پاؤں میں بجتا نہ تھا
کہا میں نے تُو تو ہے بکرا مرا
جسے میں نے اِس عید قرباں کیا
جو بکرے نے دیکھا مِرا پیچ و تاب
دیا اُس نے منہ پھیر کر یوں جواب
سمجھتا ہے تُو ہوگیا کیا مجھے
ترے ہی فریزر نے کھایا مجھے
ذرا جھانک کر دیکھ تو میری جاں
مری ٹانگ اب تک پڑی ہے وہاں
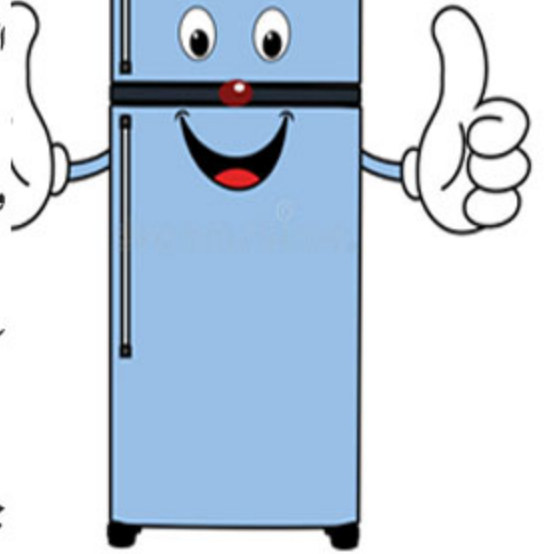
محمد خلیل الرّحمٰن

نوکر نامہ

جب بھی تنخواہ آ گئی ہے بیگمی تحویل میں
بس اور آگے نہیں جاتے ہیں اب تفصیل میں

تیس دن تک منتظر رہتے ہیں ہم قلاش لوگ
کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اُف تکمیل میں

منہ نہارے حکم صادر ہوگیا خرچہ نہیں
منٹ بھر ضائع نہیں کرتے کبھی تعمیل میں

دوڑتے ہیں دفتروں کو دیکھ سب کولھوں کے بیل
شام کو فرمائشیں ملتی ہیں پھر زنبیل میں

گو کہ ہر اتوار کو آرام کرنا چاہیے
وہ بھی کٹ جاتی ہے سودا سلف کی ترسیل میں

نوکروں کی زندگی بھی اِک معمہ ہے گہر
ہر کیم کو عید ہے باقی کٹے تذلیل میں

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

ارمان یوسف

اگلے روز علی الصبح قریشی صاحب کے ہمراہ لندن کالج آف بزنس مینجمنٹ اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی کو چل دیے۔ یہ لندن کے علاقے نارتھ چیم میں واقع ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر عمر محمود قریشی تھے جو کمال مہارت سے چیدہ چیدہ دفتری معاملات پر بات چیت کے ساتھ ساتھ گاڑی بھی چلا رہے تھے۔ لندن کی سڑکوں پر ٹریفک رینگ رہی تھی۔ اتنے میں ماڈرن ٹیوب سٹیشن کراس کیا جو لندن کے اس حصے میں نادرن لائن کا آخری سٹیشن ہے۔ کالج یہاں سے محض دس منٹ کی مسافت پہ ہے۔ گاڑی کی رفتار ملاحظہ کیجیے کہ ایک سائیکل سوار نے ہمیں پیچھے چھوڑ دیا اور ادھر عمر بھی اس کے پیچھے پیچھے، جیسے سائیکل والے کا پروٹوکول آفیسر ہو!

"بھئی! اس کو کراس کرو۔"

عمر زیرِ لب مسکراتے بولا "یہاں سائیکل والے کو بھی پوری گاڑی کی جگہ دی جاتی ہے جب تک وہ مکمل طور سے محفوظ نہ ہو، اوورٹیک نہیں کر سکتے۔"

ہم نے دل ہی دل میں سوچا سمندر کے اس پار سے یہ شہر بڑا ترقی یافتہ لگتا ہے مگر یہاں آ کے دیکھا تو پوری قوم سائیکل کے ہی پیچھے لگی دکھائی دیتی ہے۔ سائیکل بھی وہ جو آگے اور پیچھے دونوں طرف سے تنگی ہے، جس کا نہ کیریئر ہے اور نہ مڈگارڈ۔ ہلکی سی یہ سپورٹس بائیک لوگ زیادہ تر ورزش کرنے کی غرض سے استعمال کرتے ہیں یا پھر چھوٹے موٹے سفر کے لیے۔ مرزا مرحوم کی سائیکل ہوتی تو گاڑی کو چھوڑ کر آدھا میل دھکا لگاتے لگاتے رفتار پکڑنے پر لپک کر سوار ہو جاتے۔

مگر اتنی احتیاطوں کے باوجود بھی لندن سائیکل چلانے والوں کے لئے ابھی محفوظ نہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق ہر سال بیس ہزار کے قریب سائیکل سوار حادثے کا شکار ہوتے ہیں جن میں سے کچھ تو جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں سائیکل سواروں کے لئے یورپ میں سب سے محفوظ ملک ڈنمارک سمجھا جاتا ہے جبکہ یو کے دسویں نمبر پر آتا ہے۔ لہذا ضروری تھا کہ گاڑی میں ہی بیٹھے رہیں اور اگلے چند ہی منٹ میں کالج پہنچ گئے، بخیریت۔

استقبالیہ پہ شکیلہ البرٹ موجود تھی جس نے مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہا۔ جب آپ دفتر فون کرتے ہیں تو ایک میٹھی سی جو آواز سنائی دیتی ہے وہ انھیں محترمہ کی ہے۔ اب تو ہم دوہرا ثواب حاصل کر رہے تھے یعنی دیکھ بھی رہے تھے اور سن بھی۔ ریسیپشن ہی میں لگے مہمانوں کے بیٹھنے کے صوفے اور کرسیوں کے ساتھ تصاویر کا ایک بڑا فریم بھی لگا ہے اور ایک ٹی وی سکرین بھی۔ سکرین پر کالج میں ہونے والی گزشتہ تقریبات دکھائی جا رہی تھیں جبکہ تصاویر میں کہیں قریشی صاحب ملکۂ برطانیہ سے اعزاز وصول کر رہے ہیں اور کہیں سابق امریکی صدر بل کلنٹن سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ تصاویر کی اس دنیا میں گزشتہ سال سے ہونے والی امن کانفرنسز بھی دکھائی دے رہی تھیں اور پاکستانی سیاست دانوں سمیت مختلف ممالک کے سفیر، سیاست دان اور راہنما بھی شامل تھے۔ پوچھا حضرت! یہ راز تو بتایئے اتنی ڈھیر ساری تصاویر اتنے مشہور لوگوں کے ساتھ کیسے بنوا لیں۔ پتہ چلا کہ قریشی صاحب تو کم کم ہی جاتے ہیں مگر کام ایسے کرتے ہیں کہ عمائدین اور سیاست دان زیادہ تر خود ہی یہاں کھنچے چلے آتے ہیں کیونکہ یہیں فورم فار انٹرنیشنل ریلیشنز ڈویلپمنٹ (فرڈ) کا سیکرٹریٹ بھی ہے۔ جس کے پلیٹ فارم پر آپ چیئرمین کی حیثیت سے پاکستان اور بھارت کے درمیان "پچاس سالہ امن معاہدہ" بھی پیش کر چکے ہیں۔ جس کی رو سے دونوں ہمسایہ ممالک رام اور رحیم کی قسمیں کھاتے ہوئے اس بات پر متفق ہو جائیں کہ تمام تر معاملات بات چیت کے ذریعے حل کریں گے اور پچاس سال تک جنگ کا نام تک نہ لیں گے اور دفاعی بجٹ ہر سال بتدریج کم کرتے ہوئے تعلیم اور صحت کے شعبے پر خرچ کریں گے۔

"یہ پچاس سال کی شرط ہی کیوں؟ پچاس سال بعد چاہے دونوں ممالک ایک دوسرے کو زندہ نگل لیں۔"

قریشی صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "پچاس سال بعد تعلیم اور صحت کے شعبوں میں بہتری آنے کی وجہ سے جو نسل پروان چڑھے گی یقیناً اس کے سر سے جنگ کا بھوت اتر چکا ہوگا اور یاد رکھیں امن ہی خوشحالی کی ضمانت ہے نہ کہ جنگ۔"

اپنے فورم کی طرف سے افغانستان میں قیامِ امن کی کوششوں سمیت، اسلام کی دہشت گردی سے لاتعلقی اور دہشت گردی میں ملوث افراد کی ذہن سازی اور کردار سازی بھی آپ کے فرائض میں شامل ہے۔ تصاویر کو ملاحظہ کرتے ہوئے دفتر کی جانب بڑھے تو نوٹس بورڈ پر "تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ" کے مصداق حالیہ دنوں کی تقریبات کے اخباری تراشے دیکھنے کو ملے جن میں "فیوچر آف پاکستان" کانفرس بھی نمایاں ہے، پروفیسر سٹیفن کوہن جیسے عالی دماغ بھی سٹیج پر موجود ہیں۔ کونے میں ایم ٹی وی کے سابق میزبان اور "فرام ایم ٹی وی ٹو مکہ" کی مصنفہ نومسلم کرسٹیان باکر کی کتاب کی تقریب رونمائی کی تصویریں بھی دیکھنے کو ملیں۔ یہ کتاب بھی قریشی صاحب نے اپنے فورم پر چھپوائی۔ کتاب سے یاد آیا کہ اب تو قریشی صاحب خود بھی

صاحب کتاب بن چکے ہیں۔ اِن کی آپ بیتی بھی ''میرا جہاد۔ چک نمبر۴۴۴ سے بکنگھم پیلس تک'' چھپ کر مارکیٹ میں آ چکی ہے۔ اب وہ پچپن کے پیٹے میں ہیں۔ اس عمر میں اگر کوئی شخص صاحبِ اولاد ہو جائے تو بے تکلف دوست بیٹے کی مبارکباد دینے کے ساتھ ساتھ سرگوشی سے حکیم کا پتہ بھی پوچھنے لگ جاتے ہیں مگر اس عمر میں صاحبِ کتاب ہونا پہلے بیٹے کی پیدائش سے بھی زیادہ خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ اس کتاب میں قریشی صاحب نے اپنی زندگی کے تمام گوشے وا کیے ہیں کہ کس طرح فیصل آباد کی تحصیل سمندری کے ''چک ۴۴۴'' کے پرائمری سکول میں تقریری مقابلہ جیت کر زندگی کی تلخ حقیقتوں سے نبرد آزما ہو گئے۔ ہر بار قریشی صاحب کو زندگی نے ایک نیا چیلنج کیا اور انھوں نے بھی ہر بار نئے انداز سے اس کا سامنا کیا اور ہواؤں کے رخ موڑ دیے۔ ان کا پسندیدہ شعر ہے۔

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

دفتر میں پہنچے تو ان کے بڑے بیٹے طلحہ محمود قریشی اور سعد محمود قریشی کو انتظامی معاملات کی باگ ڈور سنبھالتے پایا۔ دیگر افسران میں شبانہ خان اور عبدالرحمان نمایاں ہیں۔ کالج کی جہازی سائز کی تین منزلہ عمارت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ جس کی دیکھ بھال ندیم اور شمسو چاچا کرتے ہیں۔

ہال میں کچھ طلبا سے ملاقات بھی ہوئی جس میں فردوس جمال، اشفاق گورمانی، حافظ عدیل اختر منیس، عثمان شاہد اور ثاقب قریشی شامل تھے۔

''ملک واپس جانے کی بجائے تعلیم مکمل کر لینے کے بعد اکثر طلبا برطانیہ میں ہی سیٹل ہو جاتے ہیں بنیادی وجہ کیا ہے؟'' طلباء سے تبادلہ خیال ہوا تو ایک سوال پوچھا۔

''ارمان صاحب! یہاں ذات کے تحفظ کا احساس اپنے ملک سمیت دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ جس نے یہاں چار پانچ سال گزارے ہوں، ظلمت زدہ معاشروں میں واپسی کا سوچ کر بھی کانپ اٹھتے ہیں۔ پھر بھی اکثر لوگ واپس بھی جاتے ہیں، وہ جن کی وطن کے ساتھ کمٹمنٹ ہوتی ہے۔ ملکی ترقی و خوشحالی اور بیداریٔ شعور میں اپنا سا حصہ ڈالنے کی کمٹمنٹ۔'' حافظ عدیل اختر منیس نے شاید پہلے ہی سے جواب تیار کر رکھا تھا۔

''برطانیہ میں بطور سٹوڈنٹ نئے آنے والوں کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

اشفاق گورمانی نے گلا صاف کرتے ہوئے بات شروع کی ''اول تو دونوں ممالک کے رہن سہن میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہاں اپنا بوجھ خود ڈھونا پڑتا ہے اور پھر اکثر والدین کے لاڈلے ہی آتے ہیں جنھوں نے وہاں کوئی کام نہیں کیا ہوتا۔ کوئی ہنر، ہینڈ سکل نہ ہونے کے باعث بھی مشکلات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایسے میں پاکستانی برنس مین ہی طلبا کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت زیادہ کام کی بہت کم اجرت دیتے ہیں۔ اپنے ہی زیادہ تر اپنوں کو لوٹتے ہیں۔''

کونے سے آواز آئی:

اپنے ہی گراتے ہیں نشیمن پہ بجلیاں

اتنے میں پتہ چلا کہ کھانا لگ چکا ہے۔ اسی لمحے مولانا فضل الرحمان یاد آئے۔ جب ایک بار ان سے پوچھا گیا کہ مولانا کھانا بھی تیار ہے اور نماز کا وقت بھی ہو چکا پہلے کھانا کھائیں گے یا نماز پڑھیں گے۔ مولانا نے توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا ''بھئی کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا نماز ٹھنڈی تو نہیں ہوگی، لہٰذا پہلے کھانا کھا لیا جائے!''

ارمان یوسف کا پشتنی تعلق مظفر گڑھ سے ہے لیکن سکونت بر سہا برس سے لندن میں ہے۔ ارمان صاحب خوبصورت لب و لہجے کے شاعر اور ایک اچھے انشاء پرداز ہیں۔ مختلف رسائل و جرائد میں باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ طنز و مزاح ان کا سلوبِ بیان ہے۔ ان کی اوّلین تصنیف ''لندن ایکسپریس'' ہے۔ یہ اُن کا سفرنامہ ہے جو ''ارمغانِ ابتسام'' میں بھی قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے اولین کرم فرماؤں میں سے ہیں۔

شافعہ خان

نیلم کی بس میں سفر ہو رہا ہے

مجھے اگر آپ کسی جگہ ٹور کا خالص مزے لینا چاہتے ہیں تو وہاں کی لوکل بس میں ضرور سفر کریں، آپ کو ایسے ایسے عجائبات دیکھنے کو ملیں گے جو شاید کسی عجائب گھر میں نہ ملیں۔ نیلم سفر پر اس بار میں نے "اٹھمقام" سے "کیل" تک لوکل بس کا سہارا لیا۔ حالت زار کچھ کراچی کی D 7 اور W18 سے مختلف نہ تھی۔ کہتے ہیں سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے مگر لبالب بھرے جام کی طرح اُس بس میں میں بھائی ظفر کو کہاں تلاش کرتی۔۔۔ بس ڈرائیور "پپو" ایک فربہ آدمی تھا اور شکل سے غصیلا دکھائی دیتا تھا پر کسی بھی شخص کی ظاہری حالت سے اس کے باطن کا اندازہ نہیں لگا لینا چاہیے۔ پپو ڈرائیور کی مہربانی سے مجھے آگے کی سیٹ مل گئی۔ بس نیلم ٹریک پر ہچکولے کھانے لگی۔

میرے متوازی سیٹوں پر ایک نو بیاہتا جوڑا براجمان تھا۔ محترمہ اپنے مجازی خدا سے کچھ بیزار سی نظر آ رہی تھیں۔۔۔ بس کافی بھری ہوئی ہونے کی وجہ سے قدرے دریائے نیلم کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ چونکہ گاڑیاں دریائے نیلم کی مرغوب غذاؤں میں سے ہے، اِس لئے میں نے "آیت الکرسی" کا حصار باندھ کر

دریائے نیلم سے پناہ لے لی اور احتیاطاً بس پر لکھے ڈرائیور کے فون نمبر کی تصویر اتار لی۔۔۔وہ اس لیے کہ بس دریا میں گرنے کی صورت میں پپوڈرائیور کا نمبر کسی کے ہاتھ لگ جائے اور باقی گل فون تے ہو سکے۔ویسے تو میرا موبائل واٹر پروف ہرگز نہیں ہے اور ایک بار ''بابوسر ٹاپ'' سے گرنے کا شرف بھی حاصل کر چکا ہے مگر اس کی ڈھٹائی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اُمید رکھی جاسکتی تھی کہ کوئی محقق شاید اُس میں سے پپوڈرائیور کا نمبر بازیاب کر لے۔ پپو ڈرائیور شاید نوبیاہتا جوڑے کو دیکھ کر کچھ پرجوش تھا، تیز آواز میں گانا چلا رکھا تھا۔

مبارک ہو تم کو یہ شادی تمہاری

سدا خوش رہو تم دعا ہے ہماری

تمہارے قدم چومے یہ دنیا ساری

(نوبیاہتا دولہا اپنے پیروں کی طرف ہی دیکھ رہا تھا جن پیروں کو پپوڈرائیور دنیا کو چومنے کا کہہ رہا تھا)

ہم یار ہیں تمہارے، دلدار ہیں

تمہارے

ہم سے ملا کرو

کوئی شکوہ اگر ہو اور شکایت اگر ہو

ہم سے گلا کرو

پر تم ملا کرو

(دولہے میاں نے کچھ حیرت اور کچھ شک کے ملے جلے تاثرات سے پپوڈرائیور کو دیکھا)

ہاں میں نے بھی پیار کیا ہے

(اوہو پپوڈرائیور کو گزرا زمانہ یاد آیا ہوگا۔۔۔دولہے کو یہ سوچ کر شاید کچھ اطمینان آ گیا)

پپوڈرائیور کے برابر بیٹھا ادھیڑ عمر شخص اپنے ساتھ ایک مرغا لے کر جا رہا تھا جو حالیہ بلوغت کو پہنچا تھا۔نجانے مرغے کو کیا سوجھی، وہاں کوئی مرغی بھی نہیں تھی جس کو اپنی جوانمردی سے مرعوب کرنا ہو، مگر پھر بھی اُس مرغے نے اذان دے ڈالی۔۔۔''کوکڑوں اوں'' چونکہ وہ حال ہی میں بلوغت کو پہنچا تھا اس لیے اُس کی آواز میں پختگی نہ تھی اور ''کوں'' کی آواز گلے میں دب کر ''اُوں'' ہی نکل سکی۔اُس کی آواز سن کر میری ہنسی نکل گئی مگر یہ تمسخر اس کو شاید پسند نہ آیا بڑی ہی ناراضگی سے بولا ''پٹاخ پخ پخ!''

میں نے خفت سے منہ پھیر لیا۔ کچھ ''جانداروں'' کو مذاق بالکل برداشت نہیں ہوتا۔اپنی ذات میں ہیرو بننے والی وہ چیزیں اپنے اوپر ہنسی برداشت نہیں کر سکتیں اور اکثر ناخوش ہی دکھائی دیتی ہیں۔

بس ہچکولے کھاتی ہوئی دواریاں کے اُس موڑ تک آ گئی جہاں سے ٹریک قاتل حسینہ ''رتی گلی'' کی طرف جاتا ہے۔نوبیاہتا جوڑا ہنوز بیزار دکھائی دے رہا تھا۔۔۔ یہ دوری کم کرنے کے لیے پپو ڈرائیور کچھ پرامید تھا ایک رومانوی گانا لگا ڈالا۔۔۔

اب تیرے دل میں ہم آگئے

تو؟ (دلہن ماننے کو تیار نہ تھی)

تیرے دل میں رہیں گے

تو؟ (مطلب چل پراں مر)

تجھے اپنا کہیں گے

جھوٹا (دور فٹے منہ)

(اب دلہن کی باری تھی)

دل دل دل ہے یہ میرا

تیرا گھر یہ نہیں ہے، جگہ خالی نہیں ہے

(دولہا کو اب غصہ آنے لگا غضبناک نظروں سے کبھی اپنی زوجہ تو کبھی پپوڈرائیور کو دیکھتا)۔ جہاندیدہ ڈرائیور پپو شاید یہ سمجھ نہیں پایا کہ نوبیاہتا دولہا اپنی زوجہ کو پرائیوٹ گاڑی میں لے جاتا تو یہ دوری آپ ہی دور ہو جاتی تھی۔

''شاردہ'' کی طرف بس آدھا گھنٹہ رکنی تھی۔ سارے مسافر نیچے اُتر گئے، میں بھی اُتر گئی۔ایک درخت کے پاس جا پہنچی، پاس سے ایک ٹورسٹ لڑکا Cipslays کا خالی ریپر پھینکتا ہوا گزرا۔ جانے کہاں کہاں سے آجاتے ہیں نالائق (میرے قریب سے آواز آئی میں نے مڑ کر درخت کو دیکھا)

''کیا یہ آپ ہیں؟''

''ہاں ہم ہی ہیں'' درخت نے جواب دیا

''آپ کچھ ناراض دکھائی دے رہے ہیں؟''

''ناراض ہونا تو بنتا ہے نا۔۔۔ بتاؤ ذرا وہ موا یہاں کچرا پھینک کر چلتا بنا، جانے کب سدھرے گی یہ قوم؟''

''یہ تو بالکل ٹھیک کہا آپ نے!'' میں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''خیر کدھر سے آوت ہو تم؟''

''کراچی سے!''

''اوہو بڑی دور سے آوت ہو، ویسے ہمو بھی بڑی دور سے آوت ہیں۔''

''کدھر سے؟''

''بھوپال سے۔''

''بھوپال؟ مگر یہ تو انڈیا میں ہے پھر آپ یہاں کیسے؟''

بڑی لمبی کہانی ہے بس کیا سناویں تم کا، ہوؤ کچھو یوں کہ بھوپال میں اِکو کھوتا تھا انڈین آرمی والے لے آئے اس کو کشمیر مال برداری واسطے، جس دن پنچارات کو کھل کے باڈر کراس کر گیا اور ہم ہیاں پیدا ہو گئے۔''

''تو وہ تو کھوتا یہاں پہنچا آپ یہاں کیسے پہنچے؟''

''اوہو بائیلوجی نا پڑھی ہو کا؟''

''نہیں!''

''تو اب ہم کا پولی نیشین کے طریقے بتاویں تم کا؟''

''جی کیا مطلب؟''

''اوہو، ہوؤ کچھو یوں کے کھوتا گئے اس کھا آیا تھا وہ تو شکر کہ

ہم کا نکال باہر کیا اور ہم پیدا ہو گئے ورنہ تو۔۔۔''

''ارے ارے ایسی باتیں ہر ایک کو نہیں بتاتے!'' میں نے ٹوکا۔

''اب تمھو ہر کوئی تھوڑت ہو، ہر نئے موسم میں ہیاں منڈلاتی نظر آوت ہو۔۔۔اب تو مقامی لوگ بھی تم کا پہچان لیوت ہیں، پر ایک سمسیا ہے ہم کا۔''

''وہ کیا ہے؟''

''ہم کا اپنے باوا، اماں، چاچا کی بوہت یاد آوت ہے، ہم کا چنتا ہووت ہے۔۔۔جس طرح آپ کو اپنے پیاروں کی یاد آتی ہے، اسی طرح یہاں کے لوگ بھی تو بارڈر پار اپنے پیاروں کے لی تڑپتے ہیں۔۔۔ہاں پر چنتا تو ہم کا کچھو اور ہووت ہے۔''

''وہ کیا؟''

''ہم ہیاں محفوظ ناہی ہیں۔''

''یہاں آپ کو کیا خطرہ ہے یہاں کے لوگ تو اچھے ہیں۔''

''کھترا ہے ہم کا۔۔۔ذرا دیکھو ہمری پیٹھ پر کا لکھا ہے؟''

میں نے جھانک کر دیکھا ''عبداللہ لکھا ہے''

''اور دیکھو کا لکھا ہے۔''

''دل بنا ہے اور نیچے N لکھا ہے۔''

''ہاں ساون میں آوت تھے عبداللہ بھیا۔۔۔وہ گانا گاوت جاتے ''تمرا اور ہمرا نام جنگل کے درختوں پر ابھی لکھا ہوا ہے تم کبھو جا کے مٹا آؤ'' اور ہم کا زخمی کیو جاتے نالائق، اب کون آوے گا اس کو مٹانے وہ ان کی N تھوڑی آوے گی۔۔۔اب تمھو ہی ہمرا اکو کام کرو۔۔۔عبداللہ بھیا کو بلالاوو ہیاں اور کہوو کے یہ داغ اب مٹا ڈالو اب ہیاں سرف ایکسل تو کام نہ کرت ہے۔''

''جی میں سمجھی نہیں۔''

''نہ سمجھو ہو تو اٹھائی لیو چقو اور بنائی ڈالو ایک تیر والا دل تمھو بھی!''

''ارے آپ ناراض کیوں ہوتے ہو؟ میں کوشش کروں گی کہ آپکا پیغام عبداللہ تک پہنچ جائے، ایسا کام ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔۔۔''

''دھنے واد تمہارا۔''

پپو ڈرائیور بس میں بیٹھ گیا اور بس کی روانگی کا ہارن دیا۔ میں درخت کو الوداع کہہ کر بس میں آ بیٹھی، بس چل پڑی۔ نو بیاہتا دلہن خفگی سے بس کی کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی، دولہا کے چہرے پر بیچارگی طاری تھی۔ پپو ڈرائیور نے بھڑکتا گانا لگا ڈالا۔

میرے حالات ایسے ہیں کہ میں کچھ کر نہیں سکتا
تڑپتا ہے یہ دل لیکن میں آہیں بھر نہیں سکتا

اس بول پر اچانک ہی میری نظر نو بیاہتا دولہے کے چہرے پر پڑ گئی اور اس کی بیچاری صورت پر اتنا افسوس ہوا کہ شاید نواز شریف کے نااہل ہونے پر ن لیگیوں کو نہ ہوا ہوگا۔ اُسی لمحے اُس دولہا کی نظر بھی مجھ پر پڑ گئی۔ مجھے کچھ خفت ہوئی، ایسا لگا میری چوری پکڑی گئی، دل کیا کہ کہوں میں ہرگز بدگمانی نہیں کر رہی۔۔۔میں پپو ڈرائیور سے یہ بھی تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہی گانا لگائے

تمہارے قدم چومے یہ دنیا ساری

نہیں نہیں۔۔۔بخدا میرا ان سب باتوں میں کوئی ہاتھ نہیں تھا، ان سب باتوں کے پیچھے پپو ڈرائیور کا ہاتھ تھا۔ یہ ڈرائیور ہوتے ہی ایسے ہیں دوسروں کے جذبات سے کھیلتے ہیں، کبھی ہیجان انگیز رومانوی گانے لگا کر ایک شریف النفس سنگل بندے کو محبوب کے خیالات میں گم کر دیتے ہیں تو کبھی بے وفائی کے راگ لگا کر ایک خوش باش ازدواجی رشتے کی طلاق تک نوبت لے آتے ہیں۔ میرا ان سب باتوں میں کوئی عمل دخل نہیں، یہ سب پپو ڈرائیور کی سازش تھی۔

شافعہ خان کا تعلق کراچی سے ہے۔ گو کہ لکھنے کا شوق بہت پرانا ہے مگر اس شوق کو فروغ دینے کا خیال حال ہی میں طاری ہوا ہے۔ ان کی تحریروں میں طنز و مزاح اور اصلاحی پہلو نمایاں ہیں۔ سیاحت سے گہری دلچسپی ہونے کے باعث شخصیت میں قدرت کی رنگینیوں کے عناصر بھی شامل ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' میں یہ ان کی پہلی تحریر ہے۔

عنصر شبیر

کے ٹو کا سفر اور ماجھا کنڈی

مجھے حیرت ہوتی ہے جب وہ اپنا یہ بڑا سا سر اور گوشت پوشت کا یہ پہاڑ جتنا منہ، کہ جس کے گالوں پر، رخساروں پر گوشت اس کی گردن تک لٹکتا ہے اور اسی منہ پر لگی یہ موٹی موٹی ناک۔۔۔ اللہ اللہ۔۔۔ اس سب کا بوجھ اٹھائے جب ''وہ'' اپنے منہ کو انکار کے اظہار کے لیئے دائیں سے بائیں ہلاتا ہے تو۔۔۔ نوے میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہلاتا ہے۔۔۔ تو جیسے اک زلزلہ سا آجاتا ہے۔۔۔ اس کے چہرے کی ہر چیز ہلتی ہے اور وہ ایک عجیب سی مضحکہ خیز مخلوق محسوس ہوتا ہے۔ مجھے بہت حیرت ہوتی ہے کہ۔۔۔ آخر یہ مخلوق یہ سب کس طرح اس قدر آسانی سے بار بار کر لیتی ہے کیونکہ گردن پر منڈھے ''شدید'' قسم کے گوشت کے باعث گردن تو کہیں غائب ہی ہو چکی ہے کہ:

ہر چند ہے کہ نہیں ہے
والا معاملہ اختیار کر چکی ہے۔

اس سے پوچھا کہ صاحب یہ کیا ہے؟۔۔۔ تو ادائے بے نیازی سے بولا ''اللہ کی دین ہے ویرا، ویسے میں نے کبھی غرور نہیں کیا''

بے اختیار ہمارے منہ سے نکل گیا ''انا للہ وانا الیہ راجعون۔''

نام اس کا ''معراج دین'' ہے لیکن دوست احباب میں وہ ''ماجھے کنڈی'' کے نام سے مشہور ہے اور خاصے مہذب، شریف، معزز اور مالدار قسم کے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور اپنا ''لنگوٹیا یار'' ہے۔

اس کے والد صاحب اسے جب بھی یاد فرماتے ہیں، یا کسی سے اسکے بارے گفتگو کرتے ہیں تو اسے ''نانجار، ناخلف، بیوقوف'' وغیرہ وغیرہ کے القابات وخطابات سے نوازتے اور یاد فرمانا نہیں بھولتے۔ اس طرزِ تخاطب کو 'ماجھے کنڈی' اپنے لئے اعزاز سمجھتا ہے اور خاصا ناز اور فخر کرتا ہے۔

ان خطابات والقابات کا اسے نوازنے میں ہم سب دوست اور احباب کا اچھا خاصا ہاتھ ہے۔ یہ دعویٰ ہمارا نہیں بلکہ اس پر اس کے والد گرامی کی تصدیق شدہ مہر ثبت ہے کہ بقول اُن کے، ہم سب دوست ہی ایک نمبر کے ''نانجار، ناخلف، گند دماغ، ہڈ حرام اور پرلے درجے کے بیوقوف ہیں۔''

ہماری تو خیر ہے مگر ماجھا کنڈی ان سب اعزازات میں ہمیں شامل کرنے کو تیار نہیں اور خاصا برھم ہے کہ ان اعزازات میں ''شراکت داری'' اس کی غیرت کو ہرگز ہرگز

ضربِ مومن سے تھکے ہارے واپس لوٹے تو یار لوگوں نے ایسے ایسے سوالات کئے کہ ہم نے جھنجھلا کر سر پیٹ لیا۔ وہی داستان یوسف علیہ السلام والی بات تھی کہ تمام رات سر دھنتے رہے، صبح دم پوچھتے ہیں کہ زلیخا مرد تھا یا عورت؟ ضربِ مومن کے بارے میں اتنی خبریں، مضامین، ڈائریاں، اداریے، شذرے، تنقید اور جانے کیا کچھ چھپتا رہا لیکن دوران مشق بھی ہمارے سویلین دوستوں کی طرف سے یہ سوال رہا اور اب بھی درپیش ہے کہ جب فائر نہیں ہوا، گولی نہیں چلی، توپیں داغی نہیں گئیں، راکٹ چھوڑے نہیں گئے، جہازوں نے بم گرائے نہیں۔۔۔۔۔۔ تو یہ جنگی مشق کیسی؟

جنٹلمین سبحان اللہ از کرنل اشفاق حسین

گوارا نہیں۔

والد کی ناراضگی کے باوجود وہ ہم سے تعلق کیوں رکھتا ہے؟ اس کا جواب بھی وہ خود ہی دیتا ہے، کہتا ہے کہ ''انسانیت کی فلاح کے لئے وہ ہم سے تعلق رکھتا ہے کہ دنیا کو بتا اور دکھلا سکے کہ اگر کسی نے ''کمینے دوست'' دیکھنے ہوں تو صاحب دور نہ جایئے، آیئے میرے دوستوں کا نظارہ کیجئے اور وہ بھی ''بے ٹکٹ اور صریحاً مفت''، صرف اور صرف ''خدمت خلق'' کی خاطر، بالکل ہی فری میں دکھائے جا رہے ہیں۔ گویا ہم لوگ اُس کے دوست نہ ہوئے، ''بردکھوا'' ہوئے۔

خدمت خلق کا یہ جذبہ اس میں ''کٹ کٹ'' کے بھرا ہوا ہے، اور شومئی قسمت، اس کی بھرائی بھی ہم دوستوں نے ہی مل ملا کر کی تھی۔۔۔ کب کی تھی؟؟ صاحب اسی وقت کی تھی جب ماجھے کنڈی نے مذکورہ بالا ''تاریخی'' فقرہ کہا تھا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ نام اس کا تو معراج دین ہے اور لیکن احباب اس کو کہتے ''ماجھا کنڈی'' ہی ہیں مگر اسکا شدید اصرار ہے (شدید اس لئے کہ سارے اپنے جسم کو ہلاتے ہوئے کہتا ہے جس سے شدید ارتعاش پیدا ہوتا ہے) کہ اسے ہرگز ہرگز ماجھا کنڈی نہ کہا جائے۔ اُس کی قسمت کہ ہم پھر بھی اُسی یاد اور اصرار سے اُسے ''ماجھا کنڈی'' ہی پکارتے اور سمجھتے ہیں۔۔۔ محض اس لئے کہ جب وہ اس سلسلے میں منت ترلے کرتا ہے تو بالکل اس ''ٹیڈی بیئر'' یعنی گول مٹول سے ریچھ کے مشابہ ہو جاتا ہے جو کہ کبھی گلیوں بازاروں میں ناچ ناچ کر تماشے دکھاتے تھے۔ اب ہم اس کو ''ماجھا کن ٹٹا، ماجھا پنڈی توری'' کہہ کر جنگ عظیم سوم چھیڑنے سے تو رہے۔۔۔ لہٰذا ''ماجھا کنڈی'' ہی ٹھیک ہے اور جنگ عظیم سوم تو اس وقت ہم نے ان گناہ گار آنکھوں نے خود دیکھی جب کسی نے اسے ''ماجھا گراری'' کہہ کر پکارا کہ ''گراری'' اس نے دیکھ رکھی تھی۔۔۔ ہاں اس وقت اس کا غصہ بالکل ختم ہو جاتا ہے جب کوئی اسے ''ماجھا پرکھنڈی'' کہہ کر پکارے کیونکہ ابھی تک اسے ''پرکھنڈی'' کا مطلب و معنی سے آگاہی نہیں۔

آج یہی ''ماجھے کنڈی'' فون پر ''لندن'' سے مجھ پر گرمی جھاڑ رہا ہے کہ کسی نامنجار نے اسے بتا دیا ہے کہ موسم گل پھر سے آ رہا ہے اور ہم سے پھر کہیں نہ کہیں پہاڑوں پہ جا رہے ہیں، اور جا بھی اس دفعہ کے ٹو بیس کیمپ رہے ہیں۔

''اور یار! تجھے اپنی بیٹی پر ترس نہیں آتا؟''

''آتا ہے کیوں نہیں آتا!''

''کھے تے کتھ آتا ہے، ناں یہ بتا، تم نے جانا ضرور ہے؟؟''

''ہاں یار ماجھے، مجبوری ہے، میں نہیں رہ سکتا، تو تو زیادہ بہتر جانتا ہے، کئی ایک مقامات پر تو بھی میرا ہمدم و ہمسفر رہا ہے!''

''اوے عقل کے اندھے۔۔۔ وہ چڑھتی جوانی کی باتیں اور تھیں، اس وقت اور کوئی غم نہیں تھا محبت کے غم کے سوا، ذرا کی ذرا سوچ تو سہی اگر خدانخواستہ تجھے کچھ ہو گیا تو تیری بچی اور بچی کی ماں کا کیا ہوگا؟''

''وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا''

''یار تمہارے دماغ میں ضرور کوئی ''فنی خرابی'' ہے اور یہ فنی انگریزی والی ہرگز نہیں ورنہ تجھے اس طرح مسلسل ڈسٹرب نہ کرتی۔۔۔ اچھے بھلے ''بی بے'' بچے کی طرح سارا سال سر جھکا کر نارمل زندگی بسر کرتے ہو، مگر یک دم ہی تمہارے اندر نہ جانے کون سے جراثیم سر اُٹھانے لگتے ہیں کہ تو سمجھائے بھی نہیں سمجھتا۔۔۔ اور

ہر سال یہ بیماری پوری شدت سے تجھ میں عود کر آتی ہے اور تجھے کھینچ کھانچ کر ایسی پر خطر راہوں پہ لے جاتی ہے۔ میری مانو! لاہور میں ایک بڑا ہی زبردست ڈاکٹر ہے۔۔۔ دماغ کا۔۔۔ بڑے بڑے "گڈ دماغ" اس نے درست کیے ہیں۔۔۔ میرا واقف ہے، کہو تو اس سے ٹائم لے لوں؟ تم بس جا کر اس سے مل لینا اور ہاں ضرورت پڑھنے پر وہ تمھیں "لاہور پاگل خانے" میں ایک فرسٹ کلاس قسم کا کمرہ بھی دلا سکتا ہے، تم سال کے یہ دو مہینے وہاں گزار آیا کرو، کم از کم محفوظ تو رہو گے اور اپنے گھر والوں کے سامنے بھی، جونہی دماغ سے یہ کیڑا نکلے، گھر آ جایا کرنا، کیا خیال ہے پھر۔۔۔؟" ماجھا پوری سنجیدگی سے بولا تو میرا پارہ چڑھ گیا ہاتھ پیر گرم ہو کر غصے سے کانپنے لگے مگر زبان خاموش رہی۔ اس چیز کو ماجھے نے بھی فون پر ہی محسوس کر لیا۔

"یار عنصر! میں نے ایسی کونسی بات کہ دی جو تم یوں "اُبلتے ہوئے گٹر کی مانند غصے سے بل کھا رہے ہو؟"

"چھڈ یار ماجھے۔۔۔ ابھی تم نے کچھ کہا ہی نہیں، پاگل خانے تک تو پہنچا دیا مجھے اور تو اور ابلتا ہوا گٹر؟؟؟"

"اوے خانہ ٹنگا! تو بھی تو کچھ سوچ کہ آخر تیرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کیوں ساری خلقت اپنے اپنے کام کاج چھوڑ کر تیرے "دوالے" ہو گئے ہیں، کچھ تو ہے، سوچ بٹ سوچ کچھ تو ہے جو تو غلط کرنے جا رہا ہے۔۔۔ ناشکرا کہیں کا، پتہ نہیں بٹ تو کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔۔۔ تیری عقل کے کسی خانے میں کوئی بات ہی نہیں آتی، عجیب بچپن سی تو بدروح ہے تو یار، کچھ خیال کر یار، وگرنہ زمانہ قیامت کی چال چل گیا تو تو دیکھتا رہ جائے گا، ہاتھ ملتا رہ جائے گا کچھ ہاتھ نہ آئے گا!!"

"لیکن یار ماجھے! اس میں میرا کیا قصور ہے، یار میں خود تو ایسا نہیں بنا، تم لوگ کیوں نہیں سمجھتے میرے رب نے مجھے ایسا ہی بنایا ہے۔۔۔ میں خود کو کیسے بدل سکتا ہوں۔" میں نے روہانسے انداز میں کہا تو ماجھے کنڈی کا دل پسیج سا گیا، کسی جگری یار سے، اپنی ماں سے، یا پھر بہنوں کی پلٹون سے کوئی بھی بات منوانے کا دوستو یہ سب سے اکسیر اور کمینہ نسخہ اور ہے، لیکن ذرا ٹھہرو۔۔۔ غلطی سے بھی کہیں یہ نسخہ بیگم پر نہ آزما لینا کیونکہ وہ آگے سے دوگنی توانائی اور رفتار سے رو رو کے ایسے ایسے طعنے دے گی کہ منہ چھپانا مشکل ہو جائے گا۔

تو بات ہو رہی تھی ماجھے کنڈی کی۔۔۔ میرے برسوں کے آزمائے ہوئے مجرب نسخے سے ماجھا کنڈی بھی منہ کے بل جا گرا۔ اس کے لہجے میں تندی و تیزی نہ رہی بلکہ مجبوری، لاچاری نے اس کی جگہ لے لی۔

اب نصیحتوں کے پلندے ہیں، خلوص کے ڈنڈے ہیں، محبتوں کے پھندے ہیں، دعاؤں کے کندے ہیں اور آرزوؤں اور امیدوں کے "گنڈے" ہیں یعنی کہ "پیاز"، جنھیں چھیلو تو آنکھ بھیگ جاتی ہیں مگر پھر بھی چھیلنے والا چھیلتا جاتا ہے، کاٹتا جاتا ہے اور بعض بعض افراد "وصی شاہ" بنتے ہوئے "آنکھیں بھیگ جاتی ہیں" والے اشعار لکھنا شروع ہو جاتے ہیں۔

مدیرانہ نوٹ: دوستو! یہ تو تھی جناب عنصر شبیر کی نالہ و رُوداد جو کسی ممکنہ سفرنامے کا پیشِ خیمہ بننے والی ہے۔ آپ حضرات سے التماس ہے کہ دعا گو رہیں کہ موصوف سکون سے بیٹھ کر اپنے اس سفرنامے کو مکمل صورت میں قلمبند کر لیں، اس سے پہلے کہ انہیں پھر کسی سفر کا بلاوا آ جائے۔

عنصر شبیر صاحب کا تعلق پنجاب کے شہر "گوجرانوالہ" سے ہے چنانچہ اسی نسبت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے وہ بقلم خود بھی عہد جوانی میں چھوٹے موٹے پہلوان رہ چکے ہیں۔ ایم اے اکنامکس، ایم اے اردو کر چکے ہیں۔ پیدا ہی کھلاڑی ہوئے ہیں۔ قومی سطح تک فٹبال کھیلے اور کوہ پیائی کی۔ شمالی علاقہ جات کی مختلف مقامات کی ہائیک کر چکے ہیں۔ ۱۹۹۶ء میں "کے ٹو" بیس کیمپ پر پہنچے اور وہاں سے "گوندوگورولا گلیشیر" سر کیا، تب تک چند ایک پاکستانیوں نے ہی اس درے کو عبور کیا تھا۔ مختلف ادبی تنظیموں کے رکن ہیں۔ من موجی فنکار ہیں، تین عدد سفرنامے لکھ چکے ہیں اور جب جی چاہے چھوٹا موٹا کالم بھی لکھ مارتے ہیں۔

پروفیسر ظریف خان مرحوم مزاح نگار تھے۔ وہ مختلف رسائل میں خاصی مستقل مزاجی سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ گزشتہ چند برس پہلے اُن کا انتقال ہوگیا ہے۔ ممتاز صاحب کا خاکہ اُنہیں کے بارے میں ہے۔

پروفیسر ظریف ایک بزرگ شخصیت ہیں اور اس باسمی ہیں یعنی لوگوں کو ہنسنے ہنساتے اور گدگداتے ہیں۔ ان کی اکثر تحریریں ان کی یادداشتوں پر مشتمل ہوتی ہے جنہیں دیکھ کر انسان بے ساختہ پکار اُٹھتا ہے "واہ کیا غضب کی یادداشت ہے بڈھے کی"۔ اردو سے انہیں اتنا ہی لگاؤ ہے جتنا چرچل کو انگریزی سے تھا۔ اکثر ان کی نوخیز لکھاریوں سے اس مسئلے پر چپقلش چلتی رہتی ہے۔

آپس کی بات ہے کہ پروفیسر صاحب غصے کے بہت تیز ہیں۔ ایک مرتبہ ہم نے ان کے "ہاتف" پر ایک مزاحیہ "پیغام" ارسال کیا تو وہ فوراً اشتعال میں آ گئے۔ اپنا سارا غصہ بذریعہ ہاتف ہم پر نکالا اور فرمانے لگے کہ کیونکر ان بے کار کاموں میں پڑے ہو۔ نہ اپنا وقت ضائع کرو اور نہ ہی دوسروں کا۔ ان کی یہ بات سن کر ہم بہت شرمندہ ہوگئے۔ ہاتف سے ان کا "رابطہ نمبر" حذف کیا اور اپنی "ہاتف کاپی" میں لکھ کر محفوظ کر لیا تا کہ کہیں غلطی سے ان کے نمبر پر کوئی ایسا پیغام پھر نہ پہنچ جائے اور مفت میں ایک بار پھر ہمیں اپنی بے عزتی کروانی پڑے۔ اس دور مین ٹارزن چار سو بیس بھی مظفر آباد آیا ہوا تھا اور آزاد کشمیر کی قانون ساز اسمبلی میں موجود جانداروں کو نئی تہذیب سے متعارف کروانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شام کو جب ہم دعوت پر اس کے پاس گئے تو اس سے پروفیسر صاحب کا قصہ کہہ سنایا۔ وہ مسکرایا اور کہنے لگا "بھئی لگتا ہے آپ کے پیغام کے ہجے ٹھیک نہیں تھے۔" پھر اس نے انہیں ایک مزاحیہ پیغام بھیجا جس کا انہوں نے ایک پیارا سا جواب دیا اور ہم ٹارزن کا موبائل اور اپنا منہ دیکھتے رہ گئے۔

پروفیسر صاحب دل کے بہت اچھے ہیں۔ ہمیں جب جب انگریزی کے اردو میں متبادل الفاظ کی ضرورت پڑی تو موصوف فوراً ہمیں عطاء کر دیتے۔ ہم تو ان سے الفاظ کا ذخیرہ حاصل کر کے عوام الناس پر رعب جماتے پھرا کرتے تھے اور ایک لغت تیار کرنے پر بھی غور و فکر شروع کر رکھا ہے۔ ظرافت نگر کے "دادا" کہلاتے ہیں صرف چند لوگ ہی ان کی دادا گیری سے باغی نظر آتے ہیں۔ جب یہ سندیسہ لکھتے ہیں تو ان کے سندیسے سندیسے کم پنڈورے باکس زیادہ لگتے ہیں۔ پچھلے دنوں حاجی بنے ہیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ جب یہ جمرات پر شیطان کو کنکریاں مارنے لگے تو بہت جوش میں نظر آ رہے تھے۔ اردگرد موجود لوگوں نے ان سے اتنا پر جوش ہونے کی وجہ پوچھی تو پروفیسر صاحب کچھ یوں گویا ہوئے: ہمارے ہاں شیطانوں کو مارنا تو بہت دور قریب سے دیکھنا

پاکستان کی کرکٹ ٹیم کا اعزاز

پاکستان کی کرکٹ ٹیم نے یوگنڈا کو ایک روزہ میچوں کی سیریز میں سخت مقابلے کے بعد ۳۔۲ سے شکست دے دی۔ اس جیت کے بعد پاکستان نے اس سال ہونے والے ورلڈ کپ کے کوالیفائنگ مقابلوں میں شرکت کے لئے جگہ بنالی ہے۔ کرکٹ بورڈ کے چیرمین مولانا محمد یوسف نے اس جیت پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ انہوں نے اس جیت کے خاطر خاص طور پر چلہ کاٹا تھا اور داتا صاحب جا کر محفل سماع بھی منعقد کروائی تھی۔ انہوں نے مزید کہا کہ پاکستان کی ٹیم صالح نوجوانوں پر مشتمل تھی جس کی وجہ سے وہ کفار کے لشکر کو ہرانے میں کامیاب رہی۔

۲۰۵۰ء کا پاکستان از یاسر پیرزادہ

شیطانوں کو مارنا تو بہت دور قریب سے دیکھنا بھی ممکن نہیں کیونکہ ان کی رہائش گاہوں اور عوام کے درمیان بہت دوریاں ہین اور شیطان یا تو اپنے قلعوں میں ہوتے ہیں یا ملک سے باہر۔۔۔''

خان صاحب اپنے نام کے ساتھ پروفیسر بھی لکھتے ہیں۔ ہمیں آج تک یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ پروفیسر ان کا عہدہ ہے یا پھر نام کا حصہ۔۔۔!!اس سلسلے میں پروفیسر صاحب کے دشمن بڑے زور وشور سے ان کے خلاف پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ کچھ حضرات تو انہیں ''عطائی'' پروفیسر قرار دیتے ہیں جب کہ بعض کے نزدیک پروفیسر ان کے نام کا حصہ ہے۔

ہم نے چپ شاہ سے پوچھا ''شاہ جی آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟ کیا پروفیسر موصوف واقعی پروفیسر ہیں یا پھر عطائی؟؟؟''

ہمارے اس سوال پر چپ شاہ نواب اسلم رئیسانی کی طرح جذباتی ہو گئے اور کہنے لگے'' بخاری صاحب! پروفیسر اصلی ہو یا نقلی۔۔۔ پروفیسر پروفیسر ہی ہوتا ہے۔''

اب ظریف خان کو کون بتائے کہ پروفیسر بھی انگریزی کا لفظ ہے۔

ان کے پوتے بہت خوش نصیب ہیں کیونکہ انہیں پروفیسر صاحب کی صورت میں ایک اچھی خاصی قابل اور شہرت یافتہ دادی ملی ہے۔ آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ اتنا کڑیل جوان بلکہ بوڑھا دادی کیسے ہو سکتا ہے؟؟ وہ تو دادا کہلائے جانے کے مستحق ہے۔ تو صاحبو! بات کچھ یوں ہے کہ بچے کہانیاں سننے کے لیے نانی یا دادی کے پاس جاتے ہیں اور پروفیسر صاحب سے بچوں کا رشتہ ان کے باپ کی نسبت سے تھا نہ کہ ماں کی نسبت سے۔۔۔ اس لحاظ سے وہ دادا یا دادی ہی ہو سکتے ہیں۔ چونکہ عموماً روایتوں میں ذکر دادی ہی کا ہوتا ہے کہانیوں کے ضمن میں اس لیے ہم انہیں دادی ہی کہہ پائیں گے۔

پروفیسر صاحب پٹھان بھی ہیں لیکن پشاور کے نہیں بلکہ کراچی کے ہیں اس لیے ان کی عید ہمارے ساتھ ہوتی ہے اور روزے بھی ایک ہی ساتھ رکھتے ہیں۔ چاند بھی ایک ساتھ ہی دیکھتے ہیں چاہے زمین والا ہو یا آسمان والا۔۔۔ ہاں! نسوار سے خصوصی شغف رکھتے ہیں کیونکہ یہ ان کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔

چپ شاہ کے مطابق جیسے ہتھیار مومن کا زیور ہوتے ہیں اسی طرح نسوار پٹھان کا زیور ہوتی ہے۔ پٹھان اسے بطور ہتھیار ہی استعمال کرتے ہیں۔ ان کی ہمت کی داد دینی چاہیے کہ پاؤ بھر نسوار منہ میں رکھ کر اتنے سکون سے محوِ گفتگو ہوتے ہیں جیسے منہ میں لڈو لیے بات کر رہے ہوں۔

پروفیسر صاحب نیکی کمانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور ہم ان کی اس خوبی کے گواہ ہیں۔ موصوف تو بلحاظ عمر اور بلحاظ عہدہ اور احترام ''دادا'' کہلاتے ہیں لیکن ہم ان کے دلدادہ ہیں۔

سیّد ممتاز علی بخاری جامعۂ کشمیر سے ارضیات میں ایم فل کر چکے ہیں۔ ادب سے خاصا شغف رکھتے ہیں۔ عرصہ دس سال سے طنز ومزاح، افسانہ نگاری اور کالم نگاری کرتے ہیں۔ طنز ومزاح پر مشتمل کتاب ''خیالی پلاؤ'' جلد شائع ہونے والی ہے۔ گستاخانہ خاکوں کی سازش کو بے نقاب کرتی ایک تحقیقاتی کتاب ''عصمت رسول پر حملے'' شائع ہو چکی ہے۔ بچوں کے ادب سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ مختلف اوقات میں بچوں کے دو مجلّے ''سحر'' اور ''چراغ'' بھی ان کے زیر ادارت شائع ہوئے ہیں۔ آج کل ایک آن لائن میگزین ''رنگ برنگ'' کے چیف ایڈیٹر ہیں،

صداقت حسین ساجدؔ

دو ہزار

صبح صبح بیل بجی۔موبائل اٹھا کر دیکھا۔نو ناری کال کر رہا تھا۔

"اتنی صبح اِسے کیا مصیبت پڑ گئی ہے؟" بڑبڑاتے ہوئے کال اٹینڈ کی۔

"استاد! نئی بات سن۔۔۔" وہ چھوٹتے ہی بولا۔

"سُنا!"

وہ میرے لہجے کی بے زاری کی پروا کیے بغیر بولا" وہ ڈوو۔۔۔مطلب۔۔۔ڈونلڈ ٹرمپ ہے ناں!"

"ہاں! کیا وہ مر گیا ہے۔۔۔الحمدللہ!"

اب نو ناری تپ کر بولا "استاد! وہ زندہ ہے۔"

"پھر اسے کیا ہو گیا ہے؟"

"کبھی بات پوری بھی سن لیا کر۔۔۔"

"چلو! اب سنا!"

"بات یہ ہے کہ اس نے پاکستان سے ۳۳ ارب ڈالرز مانگ لیے ہیں، جو پچھلے پندرہ سال میں امریکا نے پاکستان کو امداد دی ہے۔"

یہ سنتے ہی میں قہقہے لگانے لگا۔

نو ناری حیرت سے بولا "استاد! کیا ہوا؟"

"یہ پوچھو۔۔۔کیا نہیں ہوا؟"

"وہی بتا دو!"

"یہ جھلا ہو گیا ہے۔۔۔یہاں دو ہزار واپس نہیں کرتے، یہ ۳۳ ارب ڈالرز واپس لینے کی سوچ رہا ہے۔"

"ہیں ں ں ں ں۔۔۔"

"ہاں ں ں ں ں۔۔۔"

ساجد حسین صداقت بچوں کے ادیب ہیں، نو عمری میں ہی کئی کتابوں کے مصنف بن چکے ہیں اور اب ایک اشاعتی ادارے کی شروعات کر کے بچوں کی کتابوں کی اشاعت کا ذمہ بھی اپنے سر لے لیا ہے۔بچوں کے تقریباً ہر رسالے میں ہر ماہ اِن کی تحریریں تسلسل سے شائع ہو رہی ہیں۔ اُن کا اندازِ تحریر خاصا شگفتہ اور دلآویز ہے۔"ارمغانِ ابتسام" میں ان کی تحریریں گزشتہ برس سے شائع ہو رہی ہیں۔

ارمغانِ ابتسام کا اگلا شمارہ نئے قہقہوں کے ساتھ

اُردو طنز و مزاح پر مبنی دو ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

مئی ۲۰۱۸ء تا جون ۲۰۱۸ء

مُدیر:

نوید ظفر کیانی